# مشاہداتِ زنداں

مصنف :- مولانا حسرت موہانی

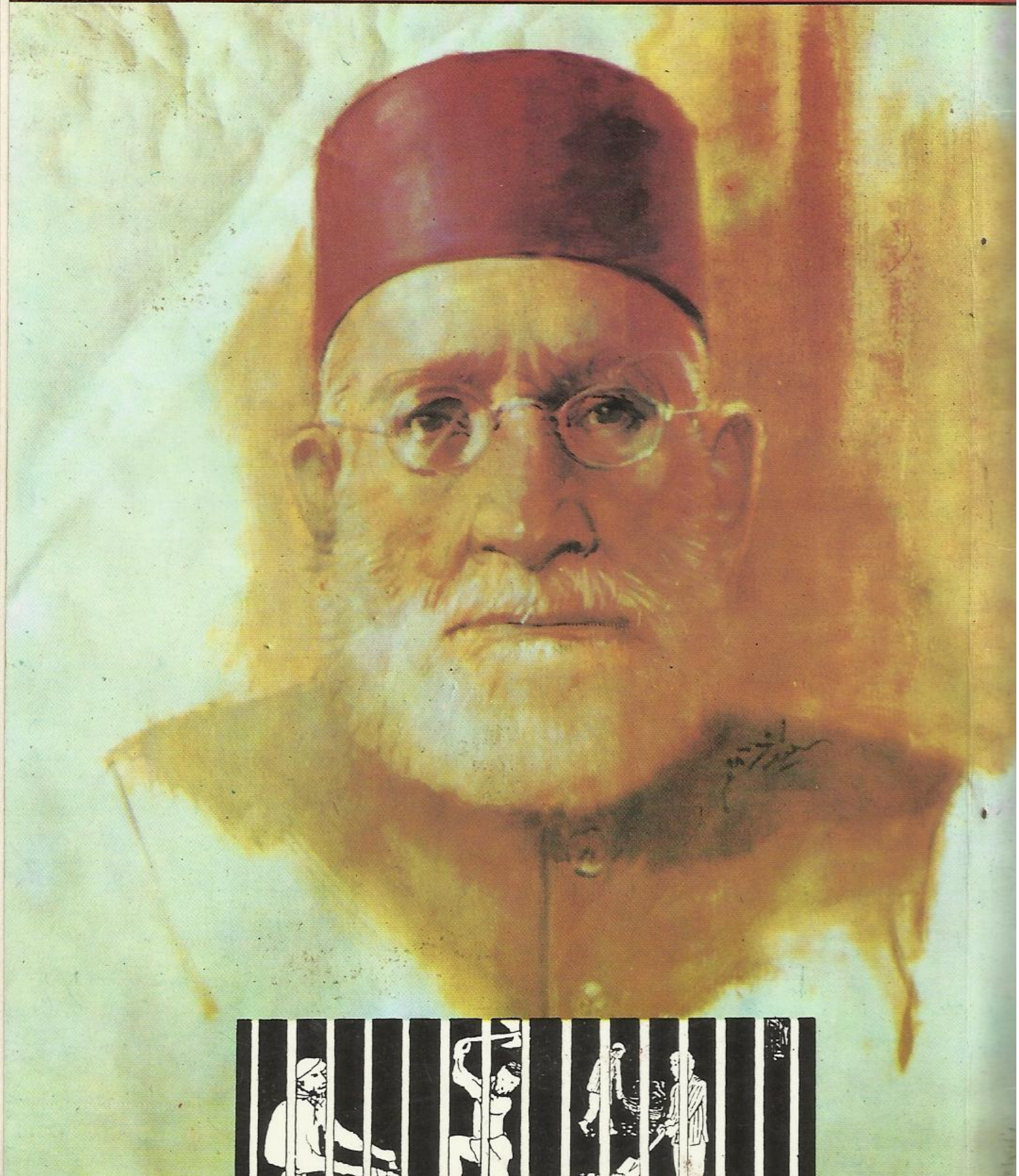

# مشاہدات زنداں

مُصنّف

مولانا حسرت موہانی

جملہ حقوق بحق سوسائٹی محفوظ ہیں

طبع ثانی ــــــــــــ ۵۰۰

قیمت ــــــــــــ ۳۲/- روپے

سن طباعت ــــــــــــ ۱۹۹۰ء

سرپرست ــــــــــــ محترمہ رئیسہ موہانی

زیر نگرانی ــــــــــــ سید وصی الحسن رضوی

طابع ــــــــــــ سید ریاض الحسن رضوی،

مطبع ــــــــــــ گلوری پرنٹرز

فون :۔ ۷۲۰۴۵، ۷

:۔ ملنے کا پتہ :۔

مولانا حسرت موہانی میموریل سوسائٹی

۹/۔ ایس ٹی ، بلاک اے متصل جامع مسجد نارتھ ناظم آباد کراچی پاکستان

فون :۔ ۶۷۸۳۰۸ ، ۶۸۶۱۴۹

| | |
|---|---|
| دیباچہ | ۵ |
| مشاہداتِ زنداں - نتائج | ۱۱ |
| پہلا واقعہ | ۱۳ |
| دوسرا " | ۱۵ |
| تیسرا " | ۱۶ |
| چوتھا " | ۱۷ |
| پانچواں " | ۲۲ |
| چھٹا " | ۲۵ |
| ساتواں " | ۳۰ |
| آٹھواں | ۳۲ |
| نواں " | ۳۷ |
| دسواں " | ۳۸ |
| گیارہواں " | ۴۵ |
| بارہواں " | ۵۲ |
| تیرہواں " | ۵۶ |
| فرنگی جیل خانوں میں کالے اور گورے کی تمیز | ۵۹ |
| پوشاک | ۶۰ |
| جائے قیام و دیگر ضروریات | ۶۱ |
| فرائض مذہبی اور عام برتاؤ | ۶۲ |

This Page Is left Blank

# دیباچہ

سید الاحرار مولانا حسرت موہانی اپنی سیاسی زندگی میں تین بار قیدِ فرنگ کا شکار ہوئے اور ایک بار ان کا اردوپریس ضبط کیا گیا لیکن ان کی پہلی قیدِ فرنگ اس لئے انتہائی تاریخی نوعیت کی حامل ہے کہ اس پہلی قید سے رہائی کے بعد انہوں نے "اردوئے معلیٰ" میں "مشاہداتِ زنداں" کے عنوان کے تحت ایک قسط وار مضمون لکھا جسے بعد میں علامہ نیاز فتحپوری نے "نگار" کے حسرت نمبر کی اشاعت کے بعد دوسرے مہینے کی "نگار" کی اشاعت میں فرمادیا۔ یہ واقعہ ۵۲-۱۹۵۱ء کا ہے۔ پھر یہی مضمون "نگار" پاکستان کی ایک اشاعت میں بھی شامل کیا گیا۔ اس مضمون کی اہمیت کا یوں اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ایک دفعہ جب میرے کسی ایک مضمون میں اس کا تذکرہ کیا گیا تو اس وقت کے شیخ الجامعہ کراچی ڈاکٹر محمود حسین خان نے مجھ سے فون پر دریافت کیا کہ کیا اس مضمون کی کوئی نقل آپ کے پاس ہے تو ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے حصولِ آزادی کے چند سال کے بعد مجھے "نگار" لکھنؤ کا حسرت نمبر اور اس کے ساتھ ہی نگار لکھنؤ کی وہ خصوصی اشاعت بھی مہیا کردی تھی جس میں "مشاہداتِ زنداں" اور جناب تسلیم لکھنوی کی حیات اور کارناموں کے متعلق مولانا حسرت موہانی کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ یہ وہی تسلیم لکھنوی ہیں جو مولانا حسرت موہانی کی شاعری میں استاد تھے اور جو نسیم دہلوی کے شاگرد ہونے کی وجہ سے لکھنؤ کے شعری ادب میں ایک اہم مقام رکھتے تھے اور چونکہ نسیم دہلوی، مومن دہلوی کے شاگرد تھے اس لئے مولانا حسرت موہانی نے اپنے ایک شعر میں اپنے کلام کو لکھنوی اور دہلوی رنگِ سخن کے ایک حسین امتزاج کا درجہ دے دیا تھا اور وہ شعر یہ ہے۔

لکھنوی انداز میں ہے رنگِ دہلی کی نمود
تجھ سے حسرتؔ نام روشن شاعری کا ہو گیا

چنانچہ میں نے ڈاکٹر صاحب کے فرمانے پر نگار لکھنؤ کے یہ دونوں نسخے انہیں روانہ کر دیئے جو بعد میں ڈاکٹر محمود حسین خان نے شکریئے کے ساتھ مجھے واپس کر دیئے اور اب یہ دونوں نسخے ڈاکٹر محمود حسین خان کی لائبریری میں موجود ہیں۔

مولانا حسرت موہانی کی یہ قید ۳ جون ۱۹۰۸ء کو شروع ہوئی اور انہیں ۴ اگست ۱۹۰۸ء کو دو سال قید سخت کی سزا سنائی گئی اور جیل کے بیشتر ایام نینی جیل الہ آباد میں بسر ہوئے بعد میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ انہیں ۳ جولائی ۱۹۰۹ء کو رہا کر دیا جائے گا لیکن صاحب توشہ حضرت احمد عبد الحق ردولویؒ کی ایک کرامت کی وجہ سے وہ پندرہ دن قبل رہا کر دیئے گئے اور رہائی کے بعد مولانا حسرت موہانی ردولی شریف پہنچے اور عرس میں شرکت کے بعد عازم علی گڑھ ہوئے۔ حضرت احمد عبد الحق ردولوی حضرت کبیر الاولیا جلال پانی پتی کے خلیفۂ اعظم تھے اور وہ حضرت علاء الدین علی احمد صابر کلیریؒ کے خلیفہ اور جانشین حضرت شمس الدین ترک پانی پتی کے خلیفہ تھے اس لئے سلسلہ صابریہ چشتیہ میں حضرت احمد عبد الحق ردولویؒ کو بہت بڑا مقام حاصل ہے اور ہر چند کہ شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ حضرت احمد عبد الحق ردولوی کے پوتے حضرت شیخ محمد ردولوی کے خلیفہ تھے لیکن ان کی روحانی ترقی کا اصل سبب اور ذریعہ بھی حضرت احمد عبد الحق ردولویؒ ہی تھے۔ جنہوں نے خود باطنی طور پر حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کی روحانی تربیت مکمل کی۔ حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی دہلی ہی کے رہنے والے تھے جہاں سے وہ نقل مکانی کر کے مشرقی پنجاب کے ایک قصبے شاہ آباد میں رہائش پذیر ہوئے اور وہاں سے منتقل ہو کر قصبہ گنگوہ ضلع سہارن پور میں آباد ہوئے اور وہیں انہوں نے انتقال فرمایا اور اس لئے انہیں ردولوی سے

بجائے گنگوہی کہا جاتا ہے۔ یہ وہی شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ ہیں، جنہوں نے سلسلہ صابریہ چشتیہ کے بانی حضرت مخدوم علاؤالدین علی احمد صابری کلیریؒ جنہیں ان کے بہت سے عقیدت مند صابر پیا" کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں کا مزار دریافت کرکے سب سے پہلے ان کا عرس منایا اور اس کے بعد ہر سال کلیر شریف میں حضرت مخدومؒ کا عرس بڑے تزک و احتشام سے منایا جاتا ہے اور اس میں خلقت کا اتنا ہجوم ہوتا ہے کہ اتنا بڑا ہجوم خود اجمیر شریف کے موقع پر بھی نہیں ہوتا اور حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کی اولاد ہی اب تک کلیر شریف کی مسندِ سجادگی پر متمکن ہے تو صاحبِ توشہ کے حوالے سے مولانا حسرت موہانی نے خود اپنے ایک مضمون میں پندرہ روز قبل رہائی کو خود ہی صاحبِ توشہ کی کرامت ہی سے تعبیر کیا۔

مولانا پر اس جیل میں جو کچھ بھی بیتی اس کا تفصیلی تذکرہ مشاہدات زنداں" میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے لیکن اس دورِ اسیری کا ایک بہت ہی بڑا واقعہ آپکے والد حضرت اظہر حسن کی رحلت ہے جس سے حکامِ جیل نے انہیں آخر وقت تک بے خبر رکھا اور جب وہ جیل سے رہا ہوئے تب ہی انہیں معلوم ہوا کہ ان کے والد رحلت فرما چکے ہیں اور ان کی رحلت کا سبب بھی یہ بتایا جاتا ہے کہ جب حکام جیل انہیں علی گڑھ سے نینی جیل لے جا رہے تھے تو ان کے والد کو بھی اس کی خبر ہو گئی اور انہوں نے اپنے بیٹے کو الہ آباد ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر لنگوٹ پہنے اور ہتھکڑی اور بیڑی سے آراستہ پا کر ذہنی طور پر اپنے آپ کو زبردست دباؤ کا شکار پایا اور یہی ذہنی دباؤ آخر کار ان کی رحلت کا باعث بنا۔ تاریخ میں اس قسم کا ایک واقعہ مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی میں ملتا ہے کہ جب وہ احمد نگر کے تاریخی قلعے میں اپنے دوسرے ساتھیوں سمیت اسیری کے ایام گزار رہے تھے تو ان کی اہلیہ

مرض الموت میں گرفتار ہوئیں تو اخبارات کے ذریعے انہیں اس علالت کی تو اطلاع ملتی رہی لیکن ان کی عزتِ نفس نے یہ گوارا نہیں کیا کہ وہ حکومت سے پیرول پر رہائی کی درخواست کریں اور وہ ابھی اس بارے میں کسی قسم کا کوئی فیصلہ کرنے نہیں پائے تھے کہ ان کی اہلیہ رحلت فرما گئیں جس پر لازماً ان کو شدید صدمہ پہنچا اور اس صدمے کا ذکر ان کے ان خطوط میں موجود ہے جو "غبارِ خاطر" میں شائع ہو چکے ہیں لیکن مولانا حسرت کا معاملہ اس لحاظ سے بالکل منفرد ہے کہ انہیں اپنے والد کی رحلت کی اطلاع ہی نہیں دی گئی چہ جائیکہ انہیں اس ضمن میں پیرول پر رہائی کے سلسلے میں سلسلہ جنبانی کا موقع میسر آتا البتہ چند برس قبل جب مولانا اسحٰق علمی مدیر روزنامہ "سیاستِ جدید" کانپور کے والد مولانا غلام یحییٰ صاحب نے رحلت فرمائی تو حکومت یوپی نے انہیں از خود پیرول پر رہا کر کے اپنے والد کی آخری رسوم میں شرکت کا موقع فراہم کیا اور اس صدی کی تیسری دہائی میں پیرول پر رہائی کا ایک واقعہ پنڈت جواہر لال نہرو کے حوالے سے بھی ملتا ہے جب انہیں اپنی اہلیہ کملا نہرو کی علالت کے وقت جب وہ سوئٹزر لینڈ میں زیرِ علاج تھیں تو پنڈت جواہر لال نہرو کو پیرول پر رہا کر کے سوئٹزر لینڈ بھیجا گیا تھا۔

مولانا حسرت موہانی جب جیل سے رہا ہوئے تو ان کی اس قید کو قلعہ احمد نگر کی قید سے تشبیہ دی جا سکتی ہے نہ اسے آغا خان پیلس کی قید سے کسی قسم کی مماثلت حاصل ہے بلکہ یہ قید تو وہ قید تھی جس کی برصغیر کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی اور واقعہ بھی یہ ہے کہ جب "مشاہداتِ زنداں" قسط وار اردوئے معلیٰ میں شائع ہونا شروع ہوئے تو پورے ملک میں ایک سنسنی سی پھیل گئی اور عوام میں وہ غیظ و غضب پیدا ہوا کہ حکومت یوپی کو جیل خانوں کی اصلاحات

کی طرف متوجہ ہونا پڑا اور ایک جیل ریفارمس کمیشن بنایا گیا جس نے مختلف جیلوں کا دورہ کر کے اپنی رپورٹ مرتب کی اور جب یہ رپورٹ شائع ہوئی تو اس کی سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کی جانب مثبت پیش رفت کا آغاز ہوا اور بعد میں مولانا ابوالکلام آزاد، جواہر لال نہرو اور مولانا اسمٰعیل ذبیح نینی جیل میں قید کیے گئے تو وہاں کے حالات مولانا حسرت موہانی کی جیل کے حالات سے قطعی مختلف تھے۔

اس پس منظر میں مولانا حسرت موہانی کی داستانِ نینی جیل غیر معمولی نوعیت کی حامل ہے اور اہل وطن کو اس کے مطالعے کی اس لیے اور بھی زیادہ ضرورت ہے کہ انہیں معلوم ہو سکے کہ آزادی کا حصول کوئی معمولی نوعیت کا واقعہ نہیں تھا۔ اس آزادی کے لیے مولانا حسرت موہانی نے اپنی پہلی اسیری کے دوران جو جسمانی، ذہنی فکری اور دینی صعوبتیں برداشت کیں وہ آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں اور یہ انہی کی قربانیوں کا صلہ ہے کہ ہم آج ایک آزاد ملک کی آزاد فضا میں سانس لے رہے ہیں اور ہم میں سے اگر کوئی آج جیل بھی جاتے تو اُسے ان صعوبتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑیگا۔ جن سے مولانا حسرت موہانی کو ۱۹۰۸ء اور ۱۹۰۹ء کے دوران نینی جیل میں واسطہ پڑا تھا۔

مشاہدات زنداں کو اس لحاظ سے بھی ہماری قومی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے کہ ہندوستان کے ایک عظیم رہنمائے آزادی لالہ راجپت رائے جنہیں ایک طویل عرصے تک شیر پنجاب کے خطاب سے بھی نوازا جاتا رہا نے مشاہدات زنداں کا انگریزی میں ترجمہ کر کے شائع کر دیا تھا اور مشاہدات زنداں کے مندرجات سے انگریزی داں طبقے کو روشناس کرایا تھا۔ یہ وہی لالہ راجپت رائے ہیں جنہوں نے ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا کے حوالے سے ۱۹۲۴ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے ایک

سابق صدر سی۔ آر داس کو انگریزی میں ایک خط لکھا تھا اور جس میں یہ بھی تحریر تھا کہ مولانا حسرت موہانی جیسی قوم پرست شخصیت بھی اب ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا کی تائید کرتی ہے قائداعظم نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لاہور منعقدہ ۱۹۴۰ء میں اپنا خطبۂ صدارت پیش کرتے وقت قرارداد لاہور کی اہمیت کے حوالے سے لالہ لاجپت رائے کے اس خط کا پوری تفصیل کے ساتھ ذکر کیا تھا۔ اس عظیم ہندو شخصیت لالہ لاجپت رائے نے جب موجودہ صدی کی دوسری دہائی میں مشاہدات زنداں کے انگریزی ترجمے کی زحمت گوارا کی تھی تو خود یہ واقعہ بھی ہماری قومی تاریخ میں مشاہدات زنداں کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔

"مشاہدات زنداں" مولانا حسرت موہانی کی خودنوشت ایام اسیری کی ایک عبرت آموز اور سبق آموز داستان ہے جو حرف بحرف صحیح ہے اور اس کا ایک ایک لفظ اہل وطن کو راہ حق میں ہر قسم کی صعوبتیں اور مصیبتیں برداشت کرنے کا حوصلہ بخش سکتا ہے اور اسی وجہ سے حسرت موہانی میموریل سوسائٹی (رجسٹرڈ) نے مولانا کی علمی، ادبی، صحافتی اور سیاسی نگارشات میں "مشاہدات زنداں" کی اشاعت کو اولیت دی اور سوسائٹی اس ضمن میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی بھی ممنون ہے جنہوں نے اس تاریخی دستاویز کا ایک نسخہ فراہم کرکے مولانا حسرت موہانی کے ساتھ اپنی اس عقیدت کا ایک واضح ثبوت فراہم کیا جس کا آغاز فتحپور سے ہوا اور جو عقیدت آج بھی ان کی زندگی کا ایک اہم جزو بنی ہوئی ہے۔

کراچی ۷ اپریل ۱۹۹۰ء

سید اشتیاق اظہر

مولانا حسرت موہانی

# مشاہداتِ زنداں

"مشاہدات زنداں" کو پہلے پہل مولانا حسرت موہانی نے اُردوئے معلّیٰ (دسمبر ۱۹۰۹ء تا جنوری ۱۹۱۱ء) میں بالاقساط شائع کیا۔ ۱۱-۱۹۱۸ء میں ہفتہ وار تاج جبلپور کے مدیر تاج الدین نے اشتراکی پریس دہلی سے کتابی صورت میں چھپوایا۔ مولانا حسرت کی وفات کے بعد علامہ نیاز فتحپوری نے جون ۱۹۵۲ء کے نگار میں اسے شامل کیا۔ اب یہ قیمتی مقالہ حسرت موہانی میموریل سوسائٹی شائع کرنے کا فخر حاصل کر رہی ہے

"بزمانہ قید فرنگ جو کچھ راقم حروف نے دیکھا یا سُنا اس کے شائع کرنے کا اوّل تو چنداں ارادہ نہ تھا لیکن بعض احباب کے اصرار سے مجبور ہو کر اب یہ فیصلہ کر لیا گیا ہے کہ مندرجہ بالا عنوان کے تحت چند دلچسپ واقعات اور حالات پیش کر دیے جائیں ابتداً صرف ان نتائج کا ذکر کیا جاتا ہے جو ان کل واقعات کو بغور دیکھ کر فقیر کی طبیعت نے اخذ کیے ہیں۔"

حسرت موہانی

تمام بھیڑ بھاڑ کے موقعوں پر عموماً اور تیسرے درجے کے ریلوے سفر میں خصوصاً عوام اہل ہند کی جہالت اور بیکسی کا نظارہ دیکھ کر اکثر لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوتا ہوگا کہ ان لوگوں کو سیاسی معاملات سے دلچسپی حاصل ہونے کے لیے ایک عرصہ دراز درکار ہے اور اس وقت تک آزادی ہند کا خیال خراب

سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا لیکن ہمارے نزدیک اس غلط فہمی کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ خواص کے غرور اور عوام کے انکسار کی بدولت ان دونوں کے درمیان تبادلہ خیالات کی نوبت ہی نہیں آنے پاتی ورنہ صاف ظاہر ہو جاتا کہ جمہوری اہلِ ہند میں سیاسی اصول کے سمجھنے اور قبول کرنے کی استعداد کافی مقدار میں موجود ہے۔ زندانِ فرنگ میں راقم حروف کو ایک قیدی کی حیثیت سے عوام کے درمیان بغایت بے تکلفی اور برابری کے ساتھ رہنا پڑا اور اس طرح پر ان کے اصل جذبات اور خیالات کے معلوم کرنے کا بہت اچھا موقع مل گیا۔ راقم کے خیال میں عوام ہند کی حیرت انگیز زیرکی تمام سیاسی مسائل کو باوجود کم علمی بلکہ بے علمی، بہت جلد اور بہت اچھی طرح اپنے ذہن نشین کر سکتی ہے جس مسئلہ کا ان کے روبرو ذکر ہوا اسے وہ لوگ چشم زدن میں نہ صرف سمجھ گئے بلکہ اس کے متعلق ایسی پختہ رائے بھی ظاہر کی جس کی بظاہر ان سے کوئی توقع نہ ہو سکتی۔ اسی ضمن میں ہم کو فریق گرم کے برسرِ حق اور نرم گروہ کے خطا پر ہونے کا قطعی ثبوت بھی پہنچا۔ کیونکہ سودیشی بائیکاٹ قومی تعلیم اور پنچایت کے اصولوں کو عوام نے بلا تکلّف سمجھا اور پسند کیا۔ برخلاف اس کے موجودہ نظامِ حکومت کی اصلاح اور عرض معروض کی پالیسی کو ان سب نے بالاتفاق مہمل قرار دیا اور اس قسم کے غلط اصول کی پیروی کو خبط اور تضیع اوقات سے تعبیر کیا۔ لاریب جمہوریہ کا یہ طبعی رجحان ہمارے مذکورہ بالا دعوے کا قطعی اور آخری ثبوت ہے۔ جن لوگوں کو خواص اپنے زعم میں ناپاک اور ذلیل سمجھ کر تمام اعلیٰ صفات سے محروم اور تعلیم و تہذیب سے مستفید ہونے کے قابل قرار دیتے ہیں ہم نے ان سب کو بخوبی آزما کر دیکھا اور ہمیں یہ معلوم کر کے نہایت خوشی ہوئی کہ قیود سے متعلق تقریباً کل اصول یک قلم باطل ہیں اور تہذیب و تعلیم کے نقص و کمال کا دار و مدار صرف سوسائٹی کی اچھائی یا برائی پر منحصر ہے۔ ہم نے اپنے قیدی دوستوں میں جن لوگوں کو سب سے زیادہ ذہین و شریف و علم دوست پایا ان میں ایک پاسی ایک کنج بندھیا ایک ہندو تیلی اور ایک مسلمان تیلی تھا۔ ہم بلا خوف تردید کہہ

سکتے ہیں کہ اگر ادنیٰ اقوام کو حصول علم و تہذیب کے ذرائع حاصل ہوں تو وہ لوگ بلا شبہ ترقی کے اعلیٰ ترین مدارج تک پہنچ سکتے ہیں۔

---

(۱)

جس شخص نے کبھی قید خانے کی صورت نہ دیکھی ہو وہ تو وہاں کے حالات سے کسی طرح آگاہ ہو ہی نہیں سکتا لیکن ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ جو لوگ جیل کی سیر بطور وزیٹر کیا کرتے ہیں وہ بھی کماحقہ وہاں کے اندرونی حالات سے واقف نہیں ہو سکتے، کس لئے کہ ملازمان جیل کی سختیاں گھرکیاں اور گالیاں، غذائے زندان کی حد سے زائد ابتر حالت، حاکمانِ جیل کے ظلم اور بے انصافیاں ان سب کی اصلی کیفیت قیدیوں کے سوا اور کسی کو معلوم نہیں ہو سکتی۔

یاد ش بخیر لالہ لال چند فلک نے آخر ۱۹۰۷ء میں بزمانہ سورت کانگریس کچھ حالاتِ زندان لاہور سنائے تھے لیکن جیل کی حقیقت راقم کے ذہن نشین صرف اس وقت ہوئی جبکہ ۲۲ جون ء کو دفعتاً بعلت سڈیشن داخل حوالات ہونا پڑا۔

داخلہ جیل کو دنیا سے قطع تعلق کے برابر نہیں تو اس سے کچھ ہی کم سمجھنا چاہیئے ارباب ہوش کو اس سے موت کا سبق حاصل ہو سکتا ہے جس طرح سے کہ اجل انسان کو تمام دنیاوی جھگڑوں سے چھڑا کر آناً فاناً ایک ایسے عالم میں پہنچا دیتی ہے جس کا کسی کو علم نہیں اسی طرح سے مقدمہ سڈیشن میں گرفتار ہونے والا اپنے تمام مشاغل اور کاروبار سے دفعتاً علیحدہ ہو کر ایک دوسری ہی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں کی آب و ہوا طریق بود و باند طرزِ رفتار و گفتار غرضکہ ہر چیز نرالی نظر آتی ہے۔ فرق صرف اس قدر سمجھ لیجئے کہ موت کے بعد اعزا و اقربا سے دائمی جدائی ہو جاتی ہے لیکن یہاں آئندہ کے لئے امید باقی رہنے کے علاوہ اختتام مقدمہ تک کبھی کبھی ان سے دور کی ملاقات بھی ہو جایا کرتی ہے۔

گرفتاری کے وقت راقم حروف کی شیر خوار لڑکی نعیمہ حد درجہ علیل تھی اور اتفاق سے مکان پر والدہ نعیمہ اور ایک خادمہ کے سوا اور کوئی موجود نہ تھا لیکن ان کی ذات سے اس نازک وقت میں بر بنائے سیادت و تائید ربانی حیرت انگیز حوصلہ و استقلال کا اظہار ہوا۔ خود پریشان ہو کر راقم کو بھی مغموم کرنے کے بجائے انہوں نے دوسرے ہی دن بذریعہ سپرنٹنڈنٹ جیل ایک ایسا ہمت افزا خط بھیجا جسے دیکھ کر حکام کار پرداز ان زندان متحیر رہ گئے راقم کا دل بفضلہ امر حق کی پیروی کے باعث یوں ہی تو ہی تھا لیکن ان کی یہ تحریر کہ تم پر جو افتاد پڑی ہے اُسے مردانہ وار برداشت کرو۔ میرا یا گھر کا مطلق خیال نہ کرنا خبردار تم سے کسی قسم کی کمزوری کا اظہار نہ ہو" تقویت مزید کا باعث ہوئی۔ بھائی صاحب کو انہوں نے تار دے کر بلوا لیا تھا جن کے ہمراہ وہ جیل میں مجھ سے ملنے بھی آئیں اور جب تک مقدمہ چلتا رہا ہر ہفتہ آیا کیں اور آخر تک ان کی جرأت و ہمت میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا۔ فالحمد للہ۔ ختم مقدمہ تک اخبار دیکھنے کی اجازت مجسٹریٹ علی گڑھ سے مل گئی تھی، اس لئے جن جن اخباروں کی نسبت میری پسند کا انہیں علم تھا وہ روزانہ بھیج دیا کرتی تھیں۔ دو ہی روز کے بعد مسٹر تلک کی گرفتاری کا حال معلوم ہوا جس کے افسوس میں راقم کو اپنی تمام مصیبتیں فراموش ہو گئیں۔ مسٹر تلک کے ڈیفنس ایڈریس کو پڑھ پڑھ کر البتہ روح تازہ اور ہمت بلند ہوتی تھی اور مجھ کو تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس ایڈریس کی سماعت کے بعد اگر جج انصاف سے کام لے گا تو مسٹر تلک ضرور بری ہو جائیں گے لیکن جسٹس داور کے فیصلہ نے ان ساری امیدوں کا خون کر دیا۔ اس کیفیت کے دوران میں ایک رباعی ذہن میں آئی تھی وہ نذر ناظرین ہے۔

طاعت ہے فرنگیوں کی جن کا دستور    کیا خاک انہیں داد گری کا ہو شعور
انصاف کے دشمنوں کا داور ہے لقب    برعکس نہند نام زنگی کافور

(۴)

حوالات میں داخل ہونے پر تو گرفتاران زندان کو سب سے زیادہ افسوسناک نظارہ حوالاتیوں کی حالتِ زار کا نظر آتا ہے کہ ادنیٰ ملازمان جیل ناجائز حصول زر کی غرض سے ان کی تذلیل کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔ بہت سے لوگ ان میں ناکردہ گناہ پولیس کا شکار اور پہلے ہی سے مظلوم ہوتے ہیں، ان کے ساتھ سنگدلی کا یہ قابل نفرین برتاؤ دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ قاعدہ جیل کی رو سے حوالاتیوں سے کچھ کام نہیں لیا جاسکتا لیکن علی گڑھ جیل میں تو ہم نے جب دیکھا کسی کو گھاس چھیلتے کسی کو جھاڑو دیتے یا کچھ نہیں تو پانی ہی بھرتے پایا کیونکہ ان خدمات سے انکار کا نتیجہ زد و کوب کی ذلت کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ بعض لوگوں پر بلا ثبوت کافی محض اس لئے مقدمے قائم تھے کہ انھیں سزا نہ بھی ہوگی تو کم از کم حوالات میں رہ کر ان کی آبرو تو خاک میں مل جائے گی۔ ایسے لوگوں کے مقدمات کو اہل پولیس ملتوی کراتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ حوالات کی زندگی سے تنگ آجاتے اور بری ہونے پر بھی ایک طرح سے کافی سزا برداشت کر چکتے ہیں۔ ہم سے ایک نوجوان حوالاتی نے بقسم بیان کیا کہ پولیس نے مجھے ازراہِ عداوت ڈیڑھ مہینے سے حوالات میں بند کر رکھا ہے اور دوران مقدمہ علانیہ مجھے سنا سنا کر کہا کرتے ہیں کہ "بچا اب چھوٹ بھی جاؤ گے تو کیا تم سے سزا سے زیادہ تو ہم نے حوالات میں تکلیف بھگتوا لی"۔ یکساں طور پر مبتلائے مصیبت ہونے کی وجہ سے تمام حوالاتیوں میں باہم ایک قسم کی ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے ان میں سے اکثر ایک دوسرے سے اپنی داستان الم بیان کر کے طالب ہمدردی و تسکین ہوتے ہیں راقم حروف کا زمانۂ حوالات اسی قسم کے افسانوں کی سماعت میں صرف ہوا۔

اس بات کو جیل خانہ کے خصوصیات میں سے سمجھنا چاہیئے کہ وہاں معاملات کی اصلیت تبدیلیں یا حوالاتیوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی اور مقدمات کے تقریباً کل واقعات ظاہر ہو جاتے ہیں کیونکہ جیل میں داخل ہونے یا قید ہو جانے کے بعد پھر کوئی مجرم اپنے

رازوں کو دوسرے قیدیوں یا حوالاتیوں سے چھپانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ ہم نے عادی مجرموں کے سوا باقی اور سب قیدیوں کو عموماً سچ ہی بیان کرتے پایا۔ اب اگر ان لوگوں کے بیان صحیح تھے اور بظاہر ان کے درست نہ ہونے کا کوئی سبب نہیں معلوم ہوتا تو ہم کہہ سکتے ہیں اہل پولیس کی رشوت ستانی و جبر نیز بعض با اختیار لوگوں کی بے انصافی اور ناخدا ترسی اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ اگر لوگوں کو اس کی اصلی کیفیت معلوم ہو تو ان کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ جائیں۔ ہم ان تمام واقعات کی صحت کو باضابطہ طور پر ثابت نہیں کر سکتے ورنہ ان کے اظہار سے باز نہ رہتے۔

ان تمام واقعات کو سن سن کر راقم حروف کو اپنی گرفتاری میں بھی مصلحت ایزدی کا ایک عجیب و غریب کرشمہ نظر آتا تھا کہ اسی کی بدولت اہل پولیس و بعض حکام کو ان کے اصلی رنگ روپ میں دیکھنے اور ان کی تمام پوشیدہ کارروائیوں کے معلوم کرنے کا موقع حاصل ہوا۔

---

(۳)

تقریباً چالیس روز کی کشمکش اور بیکار طوالت کے بعد آخر کار مقدمے کا وہی فیصلہ ہوا جو اس قسم کے مقدمات میں ہمیشہ ہوا کرتا ہے یعنی ۴ اگست ۱۹۰۸ء سے قید سخت کا آغاز اس طور پر ہوا کہ کچہری سے جیل واپس پہنچتے ہی ایک لنگوٹ، جانگیا اور ایک کرتا ٹوپی پہننے کے لئے، ایک ٹکڑا ٹاٹ اور ایک کمبل بچھانے اوڑھنے کے واسطے اور ایک قدح آہنی بڑا ایک چھوٹا دیگر جملہ ضروریات کو رفع کرنے کی غرض سے مرحمت ہوا۔

ان چند چیزوں کے سوا قیدیوں کو اور کوئی شے پاس رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ابتدا میں سامان بود و ماند کی اس تقلیل سے کسی قدر تکلیف ضرور محسوس ہوتی لیکن بہت جلد طبیعت نے انہیں کے استعمال پر قانع ہو کر ایک عجیب و غریب سبق حاصل کیا کہ اگر انسان ہوا و ہوس کو ترک کر دے تو زندگی کی ضروریات اس قدر کم ہیں اور وہ بھی آتی

آسانی کے ساتھ فراہم ہو سکتی ہیں کہ بظاہر ان کے لئے انسان کو جبر و ستم یا مکر و فریب کے وسائل اختیار کرنے اور بعض اوقات اغیار کی بندگی و غلامی تک کے قبول کرنے پر آمادہ ہو جانا ایک حیرت انگیز معاملہ نظر آتا ہے. زندانی معاشرت کی یہ فقیرانہ شان ہر طرح سے راقم حروف کو مناسب حال تھی البتہ ابتداء میں بحالت نیم برہنگی فریضۂ نماز کے ادا کرنے میں تکلف ہوتا تھا لیکن رفتہ رفتہ اپنی مجبوری اور بے بسی کے احساس نے اس کا بھی خوگر بنا دیا۔ جیل کی سخت ترین مشقت "چکی" سے پہلے ہی روز سابقہ پڑا اور راقم نے بمصداق "بر سر اولاد آدم ہر چہ آید بگزرد" اس جبری خدمت کو لبسر و چشم قبول کیا۔

عام طور پر لوگوں کا خیال تھا کہ یہ مشقت چند روزہ ثابت ہوگی اور کسی سنٹرل جیل میں تبدیل ہونے پر کوئی لکھنے پڑھنے کا کام مل جائے گا. چنانچہ جب ۲ اگست کو دفعتاً تبادلہ الہ آباد کی خبر معلوم ہوئی تو لوگوں کے اس گمان کو اس بنا پر اور بھی تقویت حاصل ہوئی کہ اس جیل میں گورنمنٹ برانچ پریس اور جیل پریس کی موجودگی سے عام طور پر یہی نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ تعلیم یافتہ قیدیوں کا وہاں بھیجا جانا اسی غرض سے ہوتا ہے کہ ان سے لکھنے پڑھنے کی کوئی خدمت لے جائے گی لیکن راقم کو اہل فرنگ کی شرافت اور عالی حوصلگی سے کسی رعایت کی امید نہ تھی چنانچہ بعد میں ثابت ہوا کہ میرا خیال بالکل صحیح تھا اور الہ آباد جیل میں صرف یہی نہیں ہوا کہ بجائے کار تحریر راقم کو چکی ہی کی خدمت سپرد ہوئی بلکہ قید کی تقریباً ساری مدت روزانہ ایک من آٹا پیسنے سے سروکار رہا حالانکہ عام قیدیوں سے بھی عموماً چکی ایک یا دو ماہ سے زیادہ نہیں پسوائی جاتی۔

---

(۳)

الہ آباد کے لئے علی گڑھ جیل سے اسٹیشن تک دو پولیس والوں کے ہمراہ پا بجولاں بھیجنے کی تجویز ہوئی۔ روانگی ٹرین کا وقت قریب تھا لیکن سلاخ دار بیڑیوں کی سختی مانع رفتار تھی، علاوہ بریں آسمان کو ہجوم ابر نے عنبریں اور زمین کو خفیف ترشح نے نم کر دیا تھا۔ کچھ قدم

پا پیادہ چلنے کے بعد ہمراہی ملازمان پولیس نے حسبِ معمول از روئے قانون بیگار ایک اکا گرفتار کیا اور ہم سب اس پر سوار ہو کر اسٹیشن پہونچے واضح ہو کر گورنمنٹ نے ہمارے اخراجات سفر کے لئے کرایہ ریل کے سوا ایک پیسہ زائد نہیں دیا تھا۔ یہاں تک کہ راستے میں قیدیوں کی خوراک کے لئے ۲/۱ فی کس فی روز کے حساب سے جو رقم ملتی ہے وہ بھی نہیں دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے دن صبح تک تھوڑے سے بھنے چنوں کے سوا اور کچھ کھانے کو نہ ملا۔

اور کسی کو تو راقم حروف کی روانگی علی گڑھ کی اطلاع نہ تھی البتہ ریلوے اسٹیشن کے ملازموں میں سے جو چند لوگ واقف حال تھے وہ گرد جمع ہو گئے اور افسوس کرتے رہے۔ تین بجے سہ پہر کو ٹرین علی گڑھ سے روانہ ہو کر قریب شام ٹونڈلے پہنچی جہاں اتفاق سے انڈین ڈیلی ٹیلی گراف کا ایک پرچہ دستیاب ہو گیا۔ دس بارہ روز سے چونکہ کوئی اخبار دیکھنے کو نہ ملا تھا اس لئے اس کا ایک ایک حرف بڑے شوق اور اضطراب کے ساتھ پڑھا۔ ترکی میں دستوری حکومت کے قائم ہونے کا حال معلوم کر کے مسرت بے اندازہ حاصل ہوئی۔ اس روز کے بعد سے پھر آخر مدت قید تک اور کسی اخبار کی صورت تک نظر نہ آئی اور حق یہ ہے جیل میں یہی ایک تکلیف ایسی تھی جسے راقم نے سب سے زیادہ محسوس کیا۔

زمانہ حوالات کے آئے ہوئے اخباروں، کتابوں اور کپڑوں کی ایک گٹھری بھی ہمراہ تھی۔ اثنائے راہ میں آخری بار دیوان حافظ کی زیارت نصیب ہوئی۔ حافظ کی غزلیں ارباب ذوق و محبت کے لئے ہر حالت میں سرمایہ سرور ثابت ہوتی ہیں چنانچہ اس فقیر کے قلب مضطر نے بھی باوجود بے اطمینانی ان سے بہت کچھ تسکین حاصل کی۔ ایک غزل نے خصوصیت کے ساتھ دل پر اثر کیا۔ اس قدر کہ راقم حروف نے اسے زبانی یاد کر لیا اور دوران قید میں بحالت تنہائی بارہا اور ہر بار نیا لطف پایا۔

ملاحظہ ہو:۔

خیز تا از درِ مے خانہ کشادے طلبیم | بر درِ دوست نشینیم و مرادے طلبیم
لذتِ داغِ غمت بردلِ ما باد حرام | اگر از جورِ غمِ عشق تو دادے طلبیم
زادِ راہِ حرم دوست ندایم مگر | بگدائی ز درِ میکدہ زادے طلبیم
چوں غمت را نتواں یافت مگر در دلِ شاد | ما بامیدِ غمت خاطرِ شادے طلبیم
بر درِ مدرسہ تا چند نشینی حافظؔ | خیز تا از درِ مے خانہ کشادے طلبیم

ٹونڈے میں چند نوجوان لوگوں کو شاید راقم کا حال معلوم ہو گیا تھا کیونکہ جب ٹرین وہاں سے چلی تو انھوں نے پلیٹ فارم کے آخری حصے کے قریب جمع ہو کر بڑے خلوص کے ساتھ باچشمِ پر نم سلام کیا۔

کان پور میں ایک صاحب نے آکر دریافت کیا کہ غالباً آپ اُردوئے معلّٰی کے ایڈیٹر حسرت موہانی ہیں اور جواب اثبات میں پاکر کچھ دیر ہمدردانہ باتیں کرتے رہے انہیں بھی الہ آباد جانا تھا اس لئے راستے میں ان سے کئی بار ملنا ہوا۔ والد مرحوم کی نسبت مجھ کو معلوم تھا کہ وہ اپیل کی غرض سے الہ آباد ہی ہوں گے اس لئے میں نے انہیں صاحب کے ذریعہ سے اپنے تبادلہ الہ آباد کی اطلاع اور سنٹرل جیل میں مل جانے کی درخواست کردی تھی۔ والد مرحوم کے جائے قیام سے مجھ کو آگاہی نہ تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ صاحب موصوف نے انہیں بکوشش تلاش کرکے میرا پیام اس روز پہنچادیا۔ کیونکہ دو ہی چار روز کے بعد معلوم ہوا کہ والد مرحوم نے مجھ سے ملنے کی درخواست پیش کی ہے لیکن افسوس کہ سپرنٹنڈنٹ جیل نے ان کی درخواست کو کسی مصلحت سے منظور نہیں کیا اور وہ ناکام واپس آگئے۔ مجھ کو اس واقعہ کا کسی قدر افسوس ہوا خصوصاً اس لئے کہ اپیل کے متعلق جو کچھ کارروائی ہو رہی تھی اس کا کچھ بھی حال معلوم نہ ہو سکا۔

والد مرحوم کو میرے اس طرح سے گرفتارِ مصیبت ہونے کا بے انتہا تعلق تھا، چنانچہ جیل سے واپس آنے پر اکثر اعزا کی زبانی معلوم ہوا کہ اس واقعے کے بعد ان کی صحت کبھی صحیح نہیں

رہی اور آخرکار میری عدم موجودگی ہی میں انھوں نے انتقال فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جیل میں مجھ کو اس واقعے کی خبر تک نہیں ہوئی الہ آباد کا سینٹرل جیل نینی میں ہے جہاں جانے کیلئے الہ آباد سے آگے نینی جنکشن پر اترنا ہوتا ہے ہم لوگ صبح کو وہاں پہنچ کر آٹھ بجے کے قریب سینٹرل جیل میں داخل ہوتے۔ علی گڑھ جیل کے کپڑے اتار لیے گئے اور کہا گیا کہ یہاں کے کپڑے کچھ دیر میں ملیں گے اس وقت تک کالے کپڑے پہنو جن کی کیفیت یہ تھی کہ ان سے زیادہ کثیف غلیظ اور بدبودار کپڑوں کا تصور انسانی ذہن میں نہیں آسکتا۔ لیکن قہر درویش بجان درویش وہی کپڑے پہننا پڑے۔ راقم حروف کی نگاہ دوربین نہیں ہے اس لئے پڑھنے لکھنے کے اوقات کو چھوڑ کر باقی ہر وقت عینک کی ضرورت رہتی ہے۔ چنانچہ علی گڑھ جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے بعد معائنہ عینک لگائے رہنے کی اجازت دے دی تھی لیکن الہ آباد والوں نے اس کو کسی طرح گوارا نہ کیا اور عینک کو داخل دفتر کر کے راقم کی بے دست و پائی کو ایک درجہ اور بڑھا دیا۔

اینہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر

تھوڑی دیر کے بعد جیلر صاحب نازل ہوئے اور میرے ساتھ کے تمام اخبار اور کاغذوں کو بانشمول دیوان حافظ اپنے سامنے جلوا کر خاکستر کر دیا اور دفتر میں حاضر ہونے کا حکم صادر فرمایا۔

دفتر میں مجھ کو غضب آلود اور قہر بار نگاہوں سے دیکھ کر ارشاد ہوا کہ اگر یہاں ٹھیک طور سے نہ رہو گے تو بیمار بنا کر اسپتال بھیجے جاؤ گے اور وہاں مار کر خاک کر دیئے جاؤ گے۔ اس خطاب پر جناب کا خاموشی کے سوا اور جواب ہی کیا ہو سکتا تھا۔ جیلر صاحب نے غالباً یہ تقریر محض دھمکانے کی نیت سے کی ہوگی کیونکہ بعد میں ان سے مجھ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قیدیوں کی نسبت جیل خانے کی یہ مشہور مثل بالکل صحیح ہے کہ "مر جائیں تو مکھی اور نکل جائیں تو شیر" جس کا مطلب یہ ہے کہ

اگر کوئی قیدی جیل میں مرجائے تو وہاں اس واقعے کی اہمیت ایک مکھی کے مرجانے سے زیادہ نہ سمجھی جائے گی لیکن اگر کوئی قیدی وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جائے تو یہ واقعہ اسی قدر اہم شمار کیا جائے گا جتنا ایک شیر کا کٹہرے سے نکل جانا۔

حاضری دفتر کی زحمت سے نجات حاصل ہونے پر سفری بیڑیاں کٹوانے اور وزن درج رجسٹر کرانے کی غرض سے روز گزشتہ سے اس وقت تک کے آئے ہوئے قیدیوں کی قطار میں بیٹھنا پڑا۔ سوامی شوانند سے اول اول اسی مقام پر ملاقات ہوئی کیونکہ وہ بھی ایک جدید قیدی کی حیثیت سے کالے کپڑوں میں وہاں موجود تھے۔

مذکورہ بالا ضروری کارروائیوں کے بعد ہم (یعنی راقم حروف و سوامی جی) حسب قاعدہ مقررہ تامعائنہ ثانی پرانی تکلیف بھیج دیئے گئے جہاں کے دس بارہ روز قیام کی کیفیت بضمن تذکرہ سوامی جی مجملاً درج اردو تے معلیٰ ہو چکی ہے۔ واضح ہو کہ الٰہ آباد سینٹرل جیل کے چار خاص حصے ایک ہی چہار دیواری کے اندر لیکن علیحدہ علیحدہ بنے ہیں اول نئی تکلیف جس میں زیادہ تر کمسن نوجوان یا وہ قیدی رکھے جاتے ہیں جو گورنمنٹ برانچ پریس میں کام کرتے ہیں۔ دوم پرانی تکلیف جس میں عارضی طور پر نئے آئے ہوئے قیدی یا جنگجو و شورہ پشت لوگوں کے سوا کوٹھریوں میں قید تنہائی بسر کرنے کے لئے تمام جیل سے ہر ہفتے کچھ قیدی آتے جاتے رہتے ہیں۔ پرانی اور نئی تکلیفوں کی بارکوں کی وضع یہ ہے کہ ہر ایک بارک میں دو رویہ کوٹھریاں بنی ہیں اور درمیان میں ایک کھلا ہوا احاطہ ہے جسے جیل کی زبان میں آنگنا کہتے ہیں۔ یہاں قیدیوں کے نہانے اور پاخانے وغیرہ کا انتظام ہوتا ہے۔

باقی سے دو احاطے ایک نیا احاطہ جس میں زیادہ دوبارہ، زیادہ مرتبہ کے سزا یافتہ قیدی رکھے جاتے ہیں۔ دوسرا پرانا احاطہ اس میں زیادہ یک بارہ قیدی رہتے ہیں۔ ان دونوں احاطوں کی بارکوں میں کوٹھریاں نہیں ہیں بلکہ ہر بارک میں دو رویہ برابر برابر ہر یا ۲۵ مٹی کے چبوترے قیدیوں کے لیٹنے کے واسطے بنا دیئے گئے ہیں جس

کا نتیجہ یہ ہے کہ رات کو جو چالیس پچاس قیدی ایک بارک میں بند ہوتے ہیں وہ آپس میں مل کر فرصت کے وقت بات چیت بھی کر سکتے ہیں۔

(۵)

نئی تکلیف نائب جیلر کے تحت میں رہتی ہے اور پرانے اور نئے احاطوں کے لیے علیحدہ علیحدہ یورپین نائب جیلر اور وارڈر پرانی تکلیف کے واسطے عموماً ایک ہندوستانی وارڈر مقرر ہوتا ہے جیل میں ان مختلف حصوں کی اچھائی اور برائی کا اندازہ وہاں کے حکام کی اچھائی برائی سے کیا جاتا ہے مثلاً ہمارے زمانہ میں جیلر نیز یورپین اور ہندوستانی وارڈر نیک مشہور تھے اس لئے نئے احاطے نیز نئی اور پرانی تکلیف کو قیدی فائقیت شمار کرتے تھے لیکن نائب جیلر کی سختی کا ہر شخص شاکی تھا چنانچہ اسی باعث سے پرانے احاطے کے نام سے قیدی خوف کھاتے تھے یہاں پر سختیوں کے قصے روز قیدیوں کی زبانی سننے میں آتے تھے لیکن معلوم نہ تھا کہ چند گھنٹوں میں ہم کو اسی احاطے میں جانا اور پھر وہیں تمام زمانہ قید بسر کرنا پڑے گا۔

اب ہر ایک بارک کا انتظام سنیئے کہ ان تیس چالیس قیدیوں میں سے جو ایک بارک میں بند کئے جاتے ہیں کم از کم تین برقنداز قیدی نمبردار یا نگراں کار، کم از کم چھ پہرے والے اور باقی معمولی قیدی ہوتے ہیں ہر پہرے والا رات کو دو گھنٹے پہرا دیتا ہے جس کا طریق یہ ہے کہ ایک سرے سے تمام قیدیوں کو شمار کر لینے کے بعد شمار کنندہ آخر میں خود کو بھی شمار کر کے بارک کے مقفل دروازے کے قریب آکر باواز بلند رپورٹ دیتا ہے مثلاً ۲۰ قیدی بارک نمبر ۵ میں بند ہیں تو پہرے والا یوں کہے گا۔ ایک دو تین چار ․․․․ سترہ اٹھارہ انیس ہم بیس ہیں قیدی ٹھیک ہیں صاحب۔ تالا جنگلا سب ٹھیک ہے" پانچ نمبر" رات کو چار پانچ بار ملازمان جیل کی رونڈ آتی ہے اس وقت پہرے والے کی جگہ برقنداز رپورٹ دیتا ہے کیونکہ رات بھر کے لئے بارک کے اندر ہر قسم کی جوابدہی برقندازوں ہی کے ذمے ہوتی ہے اس ذمہ داری کے عوض میں قیدیوں پر ان کو اختیار بھی کچھ حاصل ہوتا ہے چنانچہ جس طرح جیل کے مختلف احاطوں کی اچھائی یا برائی

کا دارومدار وہاں کے حاکموں کی نیکی یا بدی پر ہوتا ہے اسی طرح سے احاطے کے اندر بارکوں کا پسندیدہ ہونا برقندازوں کی نیکی یا بدی پر ہوا کرتا ہے۔

پرانی تکلیف میں ہماری اور سوامی جی کی بارک کے سب برقنداز نیک پڑھے لکھے اور ہم لوگوں پر خاص کر مہربان تھے ضلع فرخ آباد کے منشی جھمن لال قیدیوں کے کپڑوں اور طوق گلو کی تختیوں پر نمبر ڈالنے کی خدمت پر متعین تھے۔ ضلع فیض آباد کے منشی نول بہاری لال غلہ گودام میں منشی تھے اور بریلی کے داروغہ نراین داس پرانی تکلیف کے محرر تھے برقندازوں کو پوشاک عام قیدیوں سے بہتر ملتی ہے۔

وہ خوراک کا انتظام کر سکتے ہیں انہیں کاغذ پنسل رکھنے کی بھی اجازت ہوتی ہے اور وہ بضرورت احاطہ جیل کے اندر جہاں چاہیں جا سکتے ہیں۔ سوامی جی کو داروغہ صاحب روز صبح گیہوں کا دلیا منگا دیتے تھے اور شام کو ہم دونوں کے لئے صاف روٹیاں اور ترکاری بہم پہنچاتے تھے بلکہ سوامی جی اور داروغہ صاحب کی خاطر سے دوسری بارکوں کے برقنداز بھی جب کبھی خفیہ طور پر کوئی غیر معمولی چیز پکواتے تھے تو ہم لوگوں کا بھی حصہ لگایا جاتا تھا۔ سوامی جی کے ذمے بان بٹنے کا کام تھا اس لئے انہیں کہیں جانا نہ پڑتا تھا لیکن راقم حروف کو چکی پیسنے کی غرض سے پرانے یا نئے احاطے میں جانا ضروری تھا، نئے احاطے میں دوبارہ قیدی چکی پیستے ہیں اس لئے وہاں عموماً آٹا موٹا پیسا جاتا ہے اور ان سے کوئی تعرض بھی نہیں کرتا کیونکہ وہ لوگ بیباک اور مار دھاڑ سے بالکل بے خوف ہوتے ہیں اس کے برخلاف پرانے احاطے میں یکبارہ قیدی معاملات جیل سے ناواقف اور ملازموں کی زد و کوب سے ہر وقت خائف رہتے ہیں اسی لئے ان سے آٹا بہت باریک پسوایا جاتا ہے۔

داروغہ صاحب نے پہلے روز راقم کو نئے احاطے کو بھجوایا۔ نئے احاطے کا وارڈ نیک تھا اس لئے چکی خانے کے برقنداز اور جمعدار نے راقم پر کوئی خاص سختی نہ کی بلکہ داروغہ کی سفارش

سے رعایت ہی کا مستحق سمجھا، لیکن دوسرے ہی روز نائب جیلر کا حکم آگیا کہ علی گڑھ والے قیدی کو پرانے احاطے بھیج دو اور وہ ابھی پہنے نئے احاطے میں نہ جانے پائے۔ قریب شام جب ہم نئے احاطے سے کام کر کے پرانی تکلیف حسب معمول اپنی اپنی بارک میں بند ہونے کے لئے آئے تو دارو غہ صاحب اور سوامی جی کو خاموش اور رنجیدہ پایا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اسی وقت مجھ کو پرانے احاطہ میں جانا اور سوامی جی سے جدا ہونا ہوگا۔ دارو غہ صاحب نے سوامی جی کی فرمائش پر راقم حروف کی آخری دعوت کیلئے کچھ پوریاں اور کچھ حلوا تیار کر رکھا تھا۔ سوامی جی نے مجھے علیحدہ لے جاکر خود کھلایا۔ کھانے کے بعد ہم دونوں بغل گیر ہو کر بنہایت افسوس وافسردگی ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔ ابتدائی مقدمہ اردوئے معلّٰے سے اس وقت تک بہت سے افسوسناک مناظر پیش نظر ہوئے تھے لیکن مجھ کو خوب یاد ہے کہ کسی موقع پر میرے آنسو نہیں نکلے۔ لیکن اس وقت سوامی جی کو مضطر اور آبدیدہ دیکھ کر مجھے بھی ضبط نہ ہو سکا اور دیر تک باوجود ضبط آنکھیں پُرنم رہیں۔ پُرانی تکلیف سے رخصت ہو کر پُرانے احاطہ میں اس وقت پہنچنا ہوا بارکیں بند ہو رہی تھیں۔ نائب جیلر جن کے تحت میں وہ احاطہ تھا، اس وقت پانچ نمبر کو بند کرا رہے تھے۔ دفعدار نے مجھے لے جاکر ان میں پیش کیا لیکن کچھ مشورہ کرنے کے بعد یہ حکم ہوا کہ اس کو پانچ نمبر میں نہیں بلکہ سات نمبر کے پچھلے حصے میں بند کرو۔ پانچ نمبر کے برقنداز ضلع مظفر پور کے ایک تعلیم یافتہ مسلمان تھے۔ ان سے بعد میں مشورت کی حقیقت دریافت ہوئی کہ سات نمبر کا برقنداز چونکہ تمام احاطے میں بد زبان اور سخت گیر مشہور تھا۔ اسی لئے میرا اسی نمبر میں رکھا جانا مناسب سمجھا گیا۔ سات نمبر کے قیدیوں کو پہلے ہی سے یہ حکم سنا دیا گیا تھا کہ نئے آئے ہوئے قیدی سے نہ کوئی ملے اور نہ بات کرے اور برقنداز کو یہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ اس شخص کے دماغ کی گرمی نکال دو۔

پُرانا احاطہ تمام جیل میں تشدد اور سختی کے لئے بدنام تھا پھر اس احاطہ میں سات نمبر کے برقنداز کی سختی و بدزبانی بھی مشہور عام تھی۔ ان سب پر طرہ مزید سختی اور نگرانی کے خفیہ

احکام تھے۔ جن کو سن سن کر میرے لیے لوگ بہت متفکر تھے لیکن بمصداق "دشمن اگر قوی است نگہبان قوی تر ست" جن لوگوں سے بدی کی توقع تھی انھوں نے راقم کے ساتھ نیکی اور مروت کا برتاؤ کیا۔ جس کا ذکر آگے آئے گا۔

---

(۶)

بارک نمبر ۲ کے تمام قیدیوں اور برقندازوں کو راقم کے متعلق پہلے ہی سے خفیہ احکام پہنچ چکے تھے کہ نئے قیدی سے نہ کوئی ملے نہ بات کرے۔ ذاکر برقنداز بارک نے جو اپنی سختی اور بدزبانی کے لیے تمام جیل میں بدنام تھا مزید احتیاط کی غرض سے راقم کا بستر عین اپنی نشست کے سامنے لگوایا تاکہ ہر وقت کامل نگرانی آسانی کے ساتھ ہو سکے۔ لیکن بمصداق "الانسان حریص علی ما منع" اس روک ٹوک سے قیدیوں کے دل میں مجھ سے ملنے اور بات چیت کر کے دریافت حال کرنے کا اور بھی اشتیاق پیدا ہوا۔ چنانچہ دن کو تو ذاکر کے خوف سے کوئی بول نہ سکتا تھا۔ لیکن رات کو جب سب سو جاتے تھے تو ضلع شاہجہانپور کے پنڈت تلک رام پہرے والے اپنے ہر گشت میں کچھ دیر میرے قریب ٹھہر کر ضرور مصروف گفتگو ہوتے تھے یہ اس درجہ ذہین تھے کہ تھوڑی دیر کی گفتگو میں انھوں نے کل معاملات کو بخوبی سمجھ لیا کہ اخبار کسے کہتے ہیں اور سدیشی کس شے کا نام ہے۔ سودیشی اور بائیکاٹ سے وہ پہلے ہی سے واقف تھے قومی تعلیم اور پنچایت کے اصول کو بھی انھوں نے بلا تکلیف معلوم کر لیا اور دوسرے ہی تیسرے روز انھیں تلک مہاراج کے ذریعے سے تمام بارک والوں کو میرے معاملے کی خبر ہو گئی اور پھر بارک سے نکل کر بہت جلد تمام احاطے میں مشہور ہو گئی کیونکہ ہماری بارک کے قیدی قریب قریب تمام کارخانوں میں کام کرنے کے لیے جاتے تھے۔ حسن اتفاق کا یہ بھی کرشمہ قابل التفات ہے کہ مسٹر تلک کے ایک پیرو کو جیل میں بھی ہر جگہ پہلے پہل تلک ہی کے ہمنام لوگوں سے سابقہ پڑا پرانی تکلیف میں میرٹھ کے مشہور شہدہ پشت قیدی تلک سنگھ نے اس کا خیر مقدم کیا اور پرانے احاطے میں ابتدائے کلام تلک رام سے ہوئی۔

تلک سنگھ کا حال سننے کے قابل ہے یہ بزرگ چھبیس سال سے جیل میں سکونت رکھتے ہیں درمیان میں کئی بار رہا ہوئے لیکن ہر مرتبہ چند ہی ماہ کے بعد دوبارہ کسی جرم کی علت میں خوشی خوشی اپنے مسکن میں پھر داخل ہوگئے۔ پنجاب اور صوبجات متحدہ کا کوئی سینٹرل جیل ایسا نہیں ہے جس کا حال انہیں ذاتی طور پر نہ معلوم ہو۔ جب کبھی یہ اپنے کارنامے بیان کرتے تھے تو تمام سامعین ہمہ تن گوش ہو جاتے تھے۔

جیل میں آگ جلانے یا حقہ پینے کی سخت ممانعت ہے لیکن تلک سنگھ علانیہ آگ جلا کر حقہ پیتے تھے اور ملازمان جیل بھی تنگ ہو کر چشم پوشی کرتے تھے جیل کی کوئی سزا ایسی نہیں ہے جو ان کو نہ ملی ہو۔ بیڑیاں ان کے پڑی تھیں۔ کوٹھری میں یہ بند رہتے تھے۔ کپڑوں کے عوض ٹاٹ انہیں پہننے کو ملا تھا لیکن اسے بھی انہوں نے جلا دیا تھا اس لئے ایک لنگوٹ کے سوا اور کوئی کپڑا ان کے جسم پر نہ تھا۔ ٹاٹ کا بستر توڑ توڑ کر انہوں نے حقے میں ڈالا تھا اور ان تمام بدعتوں کے بعد بھی اس درجہ بے باک تھے کہ جب کبھی جیلر یا کسی دوسرے افسر کا ان کی جانب گزر ہوتا تھا تو اس سے تیل اور گڑ کی فرمائش ضرور کرتے تھے اور کبھی کبھی پا بھی جاتے تھے۔ راقم کے حال پر انکی خاص نظر عنایت تھی اپنے پاس بٹھا کر جیل کے کل معاملات کو اس خوش اسلوبی کے ساتھ سمجھا دیا تھا کہ اتنی معلومات سالہا سال کے تجربے سے بمشکل حاصل ہوتی۔ بان بٹتے تو زیادہ نہ تھے لیکن برقنداز سے کبھی سات آٹھ سو گز سے کم نہ لکھواتے تھے جس کے معنی یہ ہیں کہ مقررہ (۳۰) گز سے ہمیشہ چار یا پانچ سو گز زیادہ کام کرنے کے صلے میں آٹھ یا دس نشان روزانہ انہیں ملا کرتے تھے اور چالیس نشانوں کی ایک دن کے حساب سے ہر ماہ دس یا بارہ روز رہائی کے مستحق ٹھہرتے تھے۔

سلسلہ بیان کہاں سے کہاں جا پہنچا۔ اصل میں برقنداز ذاکر کا مذکور تھا کہ انہیں راقم حروف کی سخت نگرانی کا حکم تھا اور عجب نہیں کہ در پردہ غیر معمولی سختی کرنے کا بھی اشارہ کیا گیا ہو۔ راقم ان تمام معاملات سے آگاہ تھا لیکن ان سے یک قلم بے پروا اکثر فکر و تصور کے

دوسرے ہی عالم میں رہا کرتا تھا، چنانچہ ایک ہفتہ کے قریب اسی عنوان سے گزر گیا کہ نہ میں کسی سے بولا نہ ذاکر کو مجھ سے بات کرنے کی نوبت آئی۔ باندے کے کریم پہلوان کا بستر میرے بستر سے بالکل متصل ہوتا تھا وہ البتہ کبھی کبھی شب کو اپنی سرگزشت سنایا کرتے تھے کہ پولیس نے انہیں بے قصور ڈاکو ثابت کر کے پانچ سال کے لئے قید کروا دیا۔ واللہ اعلم۔

غازی آباد کے ایک نوجوان عبداللہ نے بھی ابتداہی سے میرے ساتھ بڑی ہمدردی اور شرافت کا برتاؤ کیا کہ جب کبھی موقع ملتا تھا وہ میری دلدہی کی کوشش کیا کرتے تھے۔ حسن اتفاق دیکھئے کہ تھوڑے ہی دنوں میں رمضان المبارک کی آمد آمد سے مسلمان قیدیوں میں ایک نئی روح پیدا ہوگئی۔ اسلامی اخوت کا جیسا زبردست اثر میں نے اس موقع پر زندان فرنگ میں محسوس کیا اس کا نقش میرے دل پر ہمیشہ موجود رہے گا۔ ہمارے بارک میں جتنے مسلمان قیدی تھے تقریباً ان سب نے روزہ رکھنے اور سحر و افطار کے وقت یکجا ہو کر کھانا کھانے کا انتظام کر لیا تھا جس سے بے سروسامانی کی حالت میں بھی اسلام کی شان مساوات و اخوت سادگی کے ایک عجیب و غریب عالم میں نمودار ہوتی تھی جس کا اثر ہم سب کے حتیٰ کہ ذاکر کے دل نے بھی قبول کیا۔ چنانچہ ایک روز وہ مجھ سے بلا تقریب مخاطب ہو کر بولے کہ "بھائی صاحب میری جانب سے سختی کا خوف آپ اپنے دل سے نکال دیجیے۔ مجھ سے جو کچھ کہا گیا ہے وہ میں کچھ نہ کروں گا بلکہ آپ کو جس چیز کی ضرورت یا جو تکلیف ہو مجھ سے بے تکلف کہہ دیجیے گا۔"

ذاکر کے اس غیر معمولی برتاؤ نے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ یہاں تک کہ بعض لوگ تو اس کو محض بناوٹ سمجھتے رہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ کہا تھا اس پر عمل کر کے دکھلایا جس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کے بعد جب تک وہ بارک میں رہے روزانہ شام کو اپنے کارخانے سے افطار و سحر کے لئے مختلف قسم کی چیزیں پکا کر لاتے تھے اور سب کے ساتھ کھاتے تھے لیکن آٹھ ہی دس دن کے بعد وہ دفعتاً بیمار ہو کر اسپتال چلے گئے اور پھر وہیں سے ہندوستان

یں حکومت برطانیہ کے پنجاہ سالہ جشن کی خوشی کے موقع پر رہا ہو گئے۔ جن لوگوں کی مشقت چکی خانہ میں تھی ان کو رمضان میں سب سے زیادہ دشواری پیش آئی کیونکہ جلد جلد پانی پینا چکی پیسنے کے لوازمات میں داخل ہے۔ علاوہ بریں بے کھائے پیئے ایک من گیہوں پیسنا یوں بھی کچھ آسان کام نہیں ہے لیکن اکثر مسلمان بہادروں نے باوجود ان تمام سختیوں کے روزہ ترک نہ کیا رحمت الٰہی نے بھی ہم لوگوں کو فراموش نہیں کیا کیونکہ لوگ یہ دیکھ کر تعجب کرتے تھے کہ دن میں دس دس بیس بیس بار پانی پینے والے ایک بار بھی پانی پئے بغیر اتنی سخت محنت کس طرح سے کر لیتے تھے۔

الغرض ایک ایک دن کر کے ماہ رمضان بھی ختم ہونے کو آیا اور آخری جمعہ کو ضلع بجنور کے میر مظفر حسین صاحب فوق کی تحریک پر نماز ادا کرنے کا بندوبست کیا گیا۔ راقم حروف نے زبانی خطبہ اور اسی وقت کے لکھے ہوئے چند الوداعی اشعار پڑھ کر نماز پڑھائی دو چار ہی روز کے بعد عید الفطر کی تقریب پیش آئی۔ لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ الٰہ آباد سنٹرل جیل میں عید کی تعطیل کا دستور تھا لیکن اتفاق سے کنگ ایڈورڈ آنجہانی کا اعلان بابت معافی قید مجرمان بتقریب جشن پنجاہ سالہ حکومت برطانیہ اسی روز حکام جیل کو ملا۔ جس نے عید کی خوشی کو دوبالا کرنے کے علاوہ تعطیل کو بھی لازمی کر دیا۔ جذبۂ امید کی خوشگواری اور فوری تاثیر کا جیسا دلچسپ سماں جیل خانوں میں نظر آتا ہے۔ اس کی مثال غالباً کہیں اور نہ مل سکے گی جیل یا بزبان عوام جیل کی خفیہ سے خفیہ خبر یا افواہ طرفۃ العین میں تمام جیل میں مشہور ہو کر قیدیوں کے چہروں کو سرور امید سے منور کر دیتی ہے اور ہر شخص اپنی رہائی کے خیال سے کم از کم تھوڑی دیر کے لئے اپنے مصائب کو فراموش کر دیتا ہے۔

غازی آباد ضلع میرٹھ کے عبد اللہ کا ذکر پہلے آ چکا ہے اس نیک دل نوجوان نے بخلوص کامل میرے انکار اور ممانعت کی مطلق پروا نہ کر کے با صرار میری ایسی خدمت کی جس کا میں مدت العمر ممنون احسان رہوں گا۔ بلا ناغہ میرے کھانے پینے کے برتنوں کی صفائی، میرے

بستر کا بارک سے باہر نکالنا اور پھر اندر لے جانا اور چکی خانے میں اپنا کام ختم کرکے میری مدد کو آنا اس نے اپنے اوپر لازم کر لیا تھا عید کے روز بھی معلوم نہیں کہاں سے چند لکڑیاں فراہم کرکے ایک گوشے میں چھپاکر میرے غسل کے لئے پانی گرم کیا اور کپڑے دھو کر صاف کر دیئے۔

عید کے روز تھوڑی دیر کے لئے تمام مسلمان قیدیوں کو اجازت ملتی ہے کہ وہ جیل اسپتال میں جمع ہو کر نماز پڑھ لیں چنانچہ اس روز بھی پرانی تکلیف، نئی تکلیف اور نئے احاطے سب لوگ آئے تھے۔ لیکن ہمارے احاطے کے وارڈر نے اپنی معمولی سختی سے کام لے کر ہم لوگوں کو احاطہ سے باہر جانے کی اجازت نہ دی۔ مجبوراً ہم ۶۰-۷۰ لوگوں کو علیحدہ نماز پڑھنا پڑی نماز کے بعد لوگوں کے اصرار سے راقم حروف نے مختصر سا وعظ بھی کہا۔ جس میں تمام فرائض اسلام کی عموماً اور فریضۂ صوم کی خوبیاں خصوصاً حاضرین کے گوش گزار کی گئیں۔

نماز عید کے بعد سارا دن جیل کے تذکروں میں صرف ہوا۔ شاہ اڈورڈ ہفتم کا فرمان یہ تھا کہ "تمام قیدیوں کی قید یا معاف کی جائے یا اس میں تخفیف ہو" لیکن غالباً درمیانی لوگوں کی دراندازی کا افسوسناک نتیجہ یہ ہوا کہ معاف تو کسی کی بھی قید نہ ہوئی۔ البتہ فی سال ایک ماہ کے حساب سے کل قیدیوں کے ٹکٹوں پر چڑھا دی گئی مگر طرفہ تماشا یہ ہوا کہ تین ماہ کے بعد روزانہ دس بیس لوگوں کی جیلیاں خارج ہونا شروع ہوئیں جس سے شاہی اعلان کی حد درجہ سبکی ہوئی۔ حقیقت حال سے ناواقف قیدی بے گناہ بادشاہ کو علانیہ برا بھلا کہتے تھے کہ دے کر کسی چیز کا واپس لینا کم ظرف لوگوں کا شیوہ ہے بادشاہوں کا طریقہ نہیں ہے۔

اس رعایت سے پولیٹکل قیدیوں کی محرومی کا قصہ ہم پہلے ہی درج کر چکے ہیں مجھ کو بھی ایک روز مع ٹکٹ اپنے روبرو طلب کرکے سپرنٹنڈنٹ صاحب نے ارشاد فرمایا کہ "تم کو جیلی نہیں ملے گا" اور ۲ ۱/۲ ماہ کی رہائی میرے ٹکٹ سے خارج کر دی۔ میں نے "عطائے تو بہ لقائے تو" کہہ کر خاموشی اختیار کی۔ یہ پینتالیس دن

تو گویا چشم زدن میں گزر گئے لیکن اہل فرنگ کی اس تنگ دلی کا افسانہ ہمیشہ کے لئے رہ گیا۔ ع "بز گردنِ او بماند بر ما بگزشت"

(۷)

الٰہ آباد سنٹرل جیل میں چکی کی مشقت سب سے زیادہ سخت ہے کیونکہ یہاں رام بانس یا ہاتھی چنگار کوٹنے کی مشقت موجود ہی نہیں ہے جو چکی سے بدتر سمجھی جاتی ہے اور جس کی نسبت ہر جیل میں یہ شعر قیدیوں کی زبان زد ہے کہ:

جیل خانے کا بُرا رویہ کوئی کسی کا یار نہیں
رام بانس کی کرنی مشقت چکی سے انکار نہیں

راقم حروف کے حال پر حکام جیل کی یہ خاص عنایت تھی کہ تقریباً تمام مدت قید اسی مشقت میں ہوئی۔ قاعدے کی رو سے فی قیدی ۱۵ سیر کے حساب سے دو قیدیوں کو ۳۰ سیر غلہ پیسنے کو ملنا چاہیے الٰہ آباد میں ۳۰ سیر کے بجائے ۴۰ سیر پسواتے ہیں جس کے عوض میں ہر سہ ماہی پر دو یا تین دن رہائی کے دیے جاتے ہیں بشرطیکہ اس عرصہ میں کوئی قصور ایسا نہ سرزد ہو جائے، جس سے پیشی کی نوبت آ جائے اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔ قیدی جب کوئی جیل کا جرم کرتا ہے تو اسے وارڈر سزا کے لئے سپرنٹنڈنٹ کے روبرو پیش کرتا ہے اسی کا اصطلاحی نام پیشی ہے جس کی عجیب و غریب روایتیں تقریباً ہر روز چکی خانے میں پیش آتی رہتی تھیں اگر چالیس سیر غلہ کا آٹا ٹھیک چالیس سیر سے چھٹانک آدھ پاؤ بھی کم ہو جائے تو پیشی۔ اگر آٹا ذرا بھی موٹا رہ جائے تو پیشی۔ اگر آٹے میں ذرا بھی مٹی یا پانی ملائے جانے کا شبہ ہو تو پیشی مٹی یا پانی ملائے جانے کا معاملہ یوں ہے کہ بعض قیدی کافی خوراک نہ ملنے کے سبب سے مجبوراً کچا غلہ چبا جانے پر مجبور ہوتے ہیں اور بعد میں آٹا پورا کرنے کے لئے گیہوں میں مٹی اور جوار یا چاولوں میں پانی ملا دیتے ہیں جو لوگ نہیں کھاتے انہیں بھی کچھ نہ کچھ ملانا ضرور پڑتا ہے

ورنہ ظاہر ہے کہ آٹا پیسنے کے دوران میں کچھ تو چکی ہی میں رہ جاتا ہے اور کچھ اڑ کر ہوا میں مل جاتا ہے کچھ پیسنے والوں کے بدن پر پسینے کے ساتھ جم جاتا ہے۔ داروغہ صاحب علانیہ فرماتے تھے کہ جو چاہو کرو ہم کو آٹا پورا دو ورنہ ہم پیشی کر دیں گے۔ چنانچہ چکی خانے کا برقنداز بھی ڈر کے مارے خود ہی قیدیوں کو مٹی چھپا کر لے آنے کی اجازت دے دیتا تھا۔

ایک روز ایک قیدی کی برقنداز سے اس بنا پر کچھ حجت ہو گئی تھی کہ برقنداز نے اسے غلہ چرا کر نہ لے جانے دیا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قیدی نے دفعدار کو بلایا اور کہا کہ برقنداز پانی ملواتا ہے۔ قسمت کی خوبی دیکھیے کہ سب سے پہلی چکی میری ہی تھی جس کے پاس ہی میرا ساتھی بقدر ضرورت یعنی قریب آدھ پاؤ یا پون پاؤ کے پانی ملا رہا تھا۔ مجھ کو اس واقع کی خبر نہ تھی کیونکہ عام طور پر غلہ پیسنے کے بعد چکیوں کے جانب پشت کر کے زمین پر لیٹ رہا کرتا تھا اور آٹے کا جھاڑنا اور بٹی میں بھرنا وغیرہ اپنے ساتھی ہی پر چھوڑ دیا کرتا تھا۔

ہنگامہ برپا ہونے پر میں نے بھی دیکھا تو معلوم ہوا کہ میرا ساتھی گرفتار ہے اس کے پاس یا میرے پاس کچھ پیسے دفعدار کو دینے کے لئے ہوتے تو معاملہ رفع دفع ہو جاتا لیکن چونکہ ہم دونوں نادار تھے اس لئے پیشی ہوئی اور کچا غلہ کھا جانے کے الزام میں تین دن رہائی ضبط ہو گئی۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کی مسکراہٹ سے یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ انھیں میری نسبت غلہ کھانے کا گمان نہیں ہے لیکن اصول جیل کے مطابق کسی ماتحت کے پیش کرنے پر سزا کا دینا لازمی تھا ورنہ اس کی سبکی ہوتی۔ میرے متعلق پیشی کا یہ دوسرا واقعہ تھا۔ پہلا واقعہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ چکیاں عموماً اس قدر وزنی ہوتی ہیں کہ ایک شخص کو ان کے اوپر کا پاٹ اٹھانا مشکل ہوتا ہے اس لئے دو شخص ایک چکی پر آمنے سامنے کھڑے ہو کر پیستے ہیں اور اگر برابر پیسے جائیں تو صبح چھ بجے سے لے کر سہ پہر کے تین بجے تک غلہ پس جاتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ دونوں پیسنے والے برابر زور لگائیں۔ میری نسبت وارڈر کو یہ گمان تھا کہ اس سے چکی نہ پس سکے گی

جب دوسرے دن برقنداز سے دریافت کرنے پر اس نے معلوم کیا کہ میں نے پہلے ہی ختم کر دیا تھا تو اسے یقین نہ آیا اور برقنداز سے ایسی باتیں کیں جن سے اس نے اپنی سمجھ کے مطابق یہ نتیجہ نکالا کہ میری نسبت وارڈر کا منشا یہ ہے کہ اس کی پیشی ہو جائے، چنانچہ تیسرے دن اس نے مجھے سب سے خراب چکی دی اور میرے جوڑیدار کو سمجھایا کہ تم ڈھیل دے دینا تمہیں ہم پیشی پر نہ بھیجیں گے نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ دس سیر غلہ باقی رہ گیا۔ قاعدے کے مطابق ہم دونوں کی پیشی ہونا چاہیئے تھی لیکن حسب قرارداد سابق صرف میری پیشی ہوئی اور دو دن کے لیے رات کو ہتھکڑیاں ڈالنے کی سزا تجویز ہوئی۔ میں چاہتا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ سے سب حال کہہ دوں لیکن برقنداز کو پیٹنے آثار زد و کوب پر آمادہ پا کر میں نے خاموشی اختیار کی اور معاملے کو خدا کے سپرد کیا۔

---

(۸)

صبح سے شام تک چکی پیسنا بجائے خود ایک سخت مشکل کام تھا لیکن راقم حروف کے لئے اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ امر یہ تھا کہ ابتدائے قید سے لے کر آخر تک کوئی کتاب رسالہ یا اخبار کسی قسم کا پڑھنے کو نہ ملا۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ شب و روز میں جس شخص کا تقریباً کل وقت شغل نوشت و خواند میں گزرتا ہو اسے دفعتاً ان تمام دلچسپیوں سے یک قلم عرصہ دراز کے لئے علیحدہ کر دینا کتنے بڑے جبر کی بات ہے معلوم ہوتا ہے کہ میری نسبت سپرنٹنڈنٹ نے اپنے ماتحتوں کو خاص تاکید کر دی تھی کہ کاغذ قلم پنسل کتاب یا اخبار تک اس شخص کو کسی طرح دسترس نہ ہو سکے۔ اس خاص سختی کے سبب چکی پیسنے کے دوران جتنے شعر خیال میں آتے تھے انہیں اکثر کئی کئی دن تک بکوشش تمام ذہن میں محفوظ رکھنا پڑتا تھا۔ ان غزلوں کے جمع ہونے اور بحفاظت جیل سے باہر پہنچ جانے کا قصہ اکتوبر ۱۹۰۹ء کے پرچے میں درج ہو چکا ہے چکی پیسنے والوں کی نگرانی ایک قیدی نمبردار کے سپرد ہوتی ہے۔ راقم حروف چونکہ

سال بھر کے قریب چکی خانہ میں رہا۔ اس لئے سیکڑوں قیدیوں اور متعدد نمبرداروں کے آنے اور تبدیل ہونے کا عجیب و غریب نظارہ دیکھنے میں آیا۔ تندرست نئے قیدیوں کو عموماً پہلے چکی ہی دی جاتی ہے اس لئے نئے آنے والوں سے سب سے پہلے ملاقات کا موقع چکی خانے والوں ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ نومبر...شئہ میں منجملہ دیگر نووارد قیدیوں کے ایک اخبار اسٹیٹسمین کلکتہ کے مینجر مسٹر ریفیل کے بیٹے بھی تھے، جنھوں نے اپنے مقدمہ کا فیصلہ بذریعہ جوری کرانے سے انکار کرکے نادانستہ طور پر یوریشین ہونے کا حق کھو دیا تھا اور دیسی عیسائیوں کے زمرے میں بجبر شامل کر دیئے گئے تھے ایک عرصہ کے بعد ایک انگریزی داں شخص سے مل کر نہایت خوشی ہوئی۔ زیادہ تر مسرت کا باعث یہ تھا کہ مسٹر ریفیل کچھ کچھ اخباری دنیا کے حالات سے بھی آگاہی رکھتے تھے، زمانۂ حوالات میں بھی ان کو "پانیر" وغیرہ پڑھنے کو مل جایا کرتا تھا کیونکہ اس وقت تک ان کے ساتھ یوریشینوں ہی کا سا برتاؤ کیا جاتا تھا اور تو سب خبریں انھوں نے صحیح بتائیں۔ لیکن مسٹر تلک کی نسبت جو امید انہوں نے ظاہر کی تھی کہ وہ غالباً پریوی کونسل میں اپیل سے رہا ہو گئے ہوں گے بعد میں غلط ثابت ہوئی مسٹر تلک کی فرضی رہائی کا مژدہ سن کر راقم نے اپنے دلی مسرت کا اظہار ایک فی البدیہہ غزل کے ذریعے سے کیا تھا جس کا مطلع اس وقت تک یاد ہے۔

نسیم صبح گاہی یہ پیام جانفزا لائی
تلک کو بیگناہی ان کی لندن سے چھڑا لائی

شوامی شوانند نے بھی ایک ہندی چیز اس موقع پر تصنیف کی تھی جس کا ایک ایک لفظ رنگ تاثیر میں ڈوبا ہوا تھا۔ خیر مسٹر ریفیل کو وہی چار روز چکی پیسنے کے بعد اس بلا سے نجات مل گئی اور وہ جیل پریس میں پروف ریڈر(ی) پر بھیج دیئے گئے۔ ایک مسٹر ریفیل ہی پر کیا موقوف ہے جتنے لوگ چکی خانے میں تھے، سب اپنے اپنے

وقت پر لیعنی کوئی ایک ہفتہ پندرہ روز کوئی ایک مہینہ اور کوئی حد درجہ تین مہینے رہ رہ کر دوسری آسان مشقتوں پر چلے چلے گئے۔ حکام جیل کی خاص عنایت سے یہ فخر اس خاکسار ہی کو حاصل ہوا کہ تقریباً سارا زمانہ قید اسی ایک شغل میں گزارنا پڑا۔ جیل میں ہر دوسرے یا تیسرے مہینے چکی پیسنے والوں کا معائنہ خاص اس غرض سے ہوا کرتا ہے کہ جو قیدی وزن میں کم ہو گئے ہوں یا جن کو چکی پیستے کئی مہینے گزر چکے ہوں وہ کسی دوسرے آسان کام پر بھیج دیے جائیں۔ راقم حروف کے زمانے میں دو تین چار بار ایسے معائنے ہوتے جن میں تقریباً تمام پرانے ساتھیوں کی مشقتیں تبدیل کر دی گئیں۔ لیکن یہ کمترین جہاں تھا وہیں رہا۔ ایک بار جیلر نے خاص کر میرے لئے تبدیلی مشقت کی سفارش بھی کی اور سپرنٹنڈنٹ کو میرے وزن کی غیر معمولی کمی[1] سے آگاہ کیا۔ لیکن سپرنٹنڈنٹ نے توجہ نہ کی اور میرے ٹکٹ کو واپس کر دیا۔ ہر روز صبح کو سب قیدی جانگیا کرتا تسلا کٹوری چکی خانے کے باہر پریڈ میں لگا کر صرف ایک لنگوٹی باندھے ہوئے اندر داخل ہو جاتے ہیں اور ان سب کی گنتی لے کر دفعدار باہر سے دروازہ بند کر کے قفل لگا دیتا ہے کھانے کے وقت دروازہ پھر کھولا جاتا ہے۔ اس سے قبل اگر کسی کو رفع حاجت کے لئے دفعدار کو دروازہ کھولنے کی تکلیف دینا پڑے تو اس تکلیف ہی کا عوض اکثر ڈنڈوں اور سونٹوں کی شکل میں یقیناً ملتا ہے۔ کئی قیدیوں کو تو اس جرم میں اتنی سزا ملی کہ عرصے تک ان کے اعضا مجروح باقی رہے۔ قیدیوں کے مارنے پیٹنے کی قانوناً ضرورت ممانعت ہے لیکن جب خود وارڈر قواعد جیل کی پابندی نہیں کرتے تو ان کے ماتحت دفعداروں سے اس کی امید رکھنا عبث ہے ہمارے سامنے اسمٰعیل قیدی کو بے رحم وارڈر نے اس قدر مارا کہ اس کا تمام جسم زخمی ہو گیا اور پھر الٹی سپرنٹنڈنٹ سے شکایت کر کے اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈلوا دیں۔ قصور اس کا صرف اتنا تھا کہ ہاتھ میں ضرب آجانے کے سبب سے اس نے چکی پیسنے سے اپنی معذوری ظاہر کی تھی۔

---

[1] داخلہ جیل سے قبل راقم حروف کا وزن ۱۳۲ پونڈ تھا لیکن اس وقت صرف ۱۰۸ پونڈ باقی رہ گیا تھا

جب کبھی گودام میں ضرورت سے زیادہ آٹا جمع ہو جاتا ہے تو دو ایک روز کے لیے "چکی" والے قیدی کسی دوسرے کام پر بھیج دیئے جاتے ہیں زیادہ تر انھیں کنگ مشین پر کربی کاٹنے یا بنولے صاف کرنے کی خدمت ملتی ہے۔ لوگ اس تبدیلی کو بہت پسند کرتے ہیں کیونکہ اسی بہانے سے کم از کم اپنے احاطے سے باہر نکلنے اور دن بھر کھلے میدان میں رہنے کا موقع مل جاتا ہے لیکن راقم حروف اس عارضی لطف سے بھی محروم رہا کیونکہ جب کبھی ایسا موقع ہوتا تھا تو وارڈر مجھ کو باہر جانے والے گروہ سے الگ کر کے چکی خانے میں بند کر دیتا تھا اور قہر درویش بجان درویش۔ اس روز اکیلے ہی چکی پیسنا پڑتی تھی صرف ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ وارڈر کی عدم موجودگی میں میں بھی اور لوگوں کے ساتھ احاطے سے باہر گیا۔ بنولے صاف کرنے کی مشین ہمارے احاطے سے کسی قدر فاصلے پر ایک ایسی جگہ نصب تھی جہاں چاروں جانب درختوں اور جھاڑیوں کی موجودگی سے نواح دیہات کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ قیدیوں نے اس موقع کی پوری قدر کی۔ یہاں تک کہ قیدی جمعدار نے بھی تھوڑی دیر کے لئے اپنی سختی کو بالائے طاق رکھ دیا۔ قیدیوں کے دو گروہ کر دیئے گئے تھے جو باری باری سے بیلوں کی طرح مشین کو گھماتے تھے ہر گروہ اپنے وقت فرصت کو کشتی لڑنے ہنسی مذاق یا راگ راگنی میں صرف کرتا تھا۔ ہمارے گروہ میں ضلع جھانسی کا ایک میراثی غوثو نامی تھا۔ لوگوں کے اصرار سے اس نے اردو ہندی کی کئی چیزیں خوب گائیں۔ راقم حروف کی طبیعت کو چونکہ موسیقی سے ایک فطری انس ہے اس لئے غوثو کی نغمہ سنجی نے دل پر قیامت کا اثر کیا۔ اس گانے کی تاثیر اس حسنِ اتفاق سے اور بھی زیادہ ہو گئی کہ ہندی چیز غوث پاک محبوب سبحانی حضرت سید عبدالقادر جیلانی رح کی شان میں تھی جن کی غلامی پر اس فقیر کو ہزاروں ناز ہیں۔ طرفہ تر یہ کہ اس ٹھمری کے آخر میں تخلص راقم کے عزیز بزرگ مولوی سید فخر الحسین فطرت موہانی کا نکلا وہ ٹھمری یہ ہے۔

سنیار تھارو نام جیسے بگداد کے مورد کا تھیا

تیرا — بغداد

نیر کی آگ لگی تن ماں دن رین کہت دَیا دَیَا

محبت رات دن

کِت جائے پیا چیری تیری سگری ہوں بپت کی میں گھیری

کہاں مصیبت

گریب نواج آنا رواب مورے سر دکھ کی گاگریا

غریب نواز

مہراج دیا کی ایک نجر فطرت کا سر توری چوکھٹ پر

نظر

حسین کا صدکا پار کرو منجدھارے موری نا دریا

چکی خانے میں پسائی کا کام عموماً وقت مقررہ سے کچھ نہ کچھ پہلے ہی ختم ہو جایا کرتا تھا اسی لئے داروغہ کے آنے تک کا وقت باہم قیدیوں کی بات چیت یا کبھی آلہا اودل کی رزمیہ نظم کے سننے میں صرف ہوتا تھا۔ راقم نے چونکہ کبھی اس لاجواب ہندی ایپک کو غور سے نہ سنا تھا اس لیے اس کی خوبیوں سے ناآشنائے محض تھا لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ ہندی زبان میں اس سے بہتر کوئی رزمیہ نظم اس وقت موجود نہیں ہے۔ اس نظم کی خوبی اور عوام کی نظروں میں اس کی پسندیدگی کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہوگا کہ اس وقت ہمارے صوبہ میں ہزاروں آدمی ایسے ہوں گے جنہیں یہ افسانہ ازبر یاد ہے۔ ایک نینی ہی کے سنٹرل جیل میں دس بارہ قیدی جن میں دو مسلمان بھی تھے، اس داستان کے حافظ موجود تھے۔ ضلع کانپور کے ٹھاکر باسدیو سنگھ اور ضلع لکھنؤ کے پنڈت تلسی رام کو آلہا کو ہم لوگ روزانہ بڑے شوق اور انتہا درجے کی توجہ سے سنا کرتے تھے۔

(۹)

راقم حروف کے چکی خانے میں داخل ہونے کے وقت دو برقنداز نگرانِ کار مقرر تھے ایک میر مظفر حسین صاحب ذوق بجنوری اور دوسرا ضلع باندا کا بندا اہیر۔ جن میں سے میر صاحب کو تو وہی تین روز میں صرف میری وجہ سے جیل پولیس کی نگرانی سپرد ہو گئی، بندا سے البتہ بہت روز تک سابقہ رہا۔ یہ وہی بزرگ ہیں جنہوں نے نائب جیلر کا اشارہ پاکر بلا وجہ میری پیشی کرادی تھی لیکن بعد میں اپنی غلطی پر نادم ہوئے۔ فی چکی دو قیدیوں کے حساب سے چکی خانہ میں جتنے قیدیوں کی ضرورت ہوتی ہے، برقنداز اُس تعداد سے ہمیشہ دو ایک آدمی زائد ضرور رکھتا ہے تاکہ اگر کوئی قیدی دفعتاً بیمار ہو جائے یا اور کوئی وجہ پیش آجائے تو کام بند نہ رہے۔ ان زائد آدمیوں کی نسبت برقنداز کو اختیار حاصل رہتا ہے کہ ان سے کوئی کام نہ لے یا لے بھی تو محض برائے نام مثلاً کسی کمزور قیدی کی مدد کر دینا یا کسی دیر میں کام ختم کرنے والے کا آٹا چھوا دینا وغیرہ اگر مخبری کا ڈر نہ ہوتا تو مجھے زائد لوگوں کے زمرے میں داخل کر لینے سے غالباً بندا کو انکار نہ ہوتا۔ لیکن نائب جیلر کے خوف سے اس غریب کو کبھی میرے ساتھ رعایت کرنے کی ہمت نہ ہوئی اور رمضان شریف کا پورا مہینہ مجھ کو چکی ہی پیستے گزرا۔ بندا اس مصیبت میں میرے ساتھ ہمدردی ضرور کرتا تھا لیکن مخبروں کی مخبری اور نائب جیلر کی بے رحمی کے خیال سے بیچارہ بالکل مجبور تھا۔ بندا کے بعد امروہے کے منشی ایزد بخش برقنداز ہوئے انہوں نے کچھ دنوں تک تو بندا ہی کی پیروی کی لیکن آخر کار اتنی رعایت کرنے لگے کہ جب کبھی موقع ہوتا تھا وہ مجھ سے کام نہ لیتے تھے۔ دسمبر کے آخری اور جنوری کے ابتدائی حصوں میں ان کی یہ رعایت مجھ کو بہت غنیمت معلوم ہوئی کیونکہ ایسی سخت سردی میں بالکل برہنہ تن ہو کر چکی پیسنے کے لئے دن بھر کھڑے رہنا کالے وارد کا مضمون تھا۔

ایزد بخش کے بعد رسول ضلع مظفر پور کے منشی عبد الحق آئے۔ یہ صاحب حضرت ذوق کی طرح شاعر تو نہ تھے تاہم کچھ نہ کچھ شوق شعر و شاعری سے ضرور رکھتے تھے ایک روز وہ

اپنے ہمراہ متفرق اشعار و غزلیات کا ایک مجموعہ بھی لائے جسے جیل پریس کے کسی خوش مذاق قیدی نے اپنے دل بہلانے کے لئے مرتب کیا تھا۔ اپنا کلام ختم کر چکنے کے بعد جب میں ان کے قریب سے گزرا تو انھوں نے وہ بیاض مجھے بھی دکھلائی۔ ایک عرصہ دراز کے بعد کتاب کی شکل دیکھ کر جتنی مسرت مجھے حاصل ہوئی اس کا اندازہ کوئی آزاد شخص ہرگز نہیں لگا سکتا۔ لیکن افسوس کہ اس واقعہ کی اطلاع کسی نامعقول نے نائب جیلر کو بھی کر دی چنانچہ اس نے دفعتاً کئی برقندازوں کے ہمراہ آکر چکی خانے کا محاصرہ کر لیا اور فرداً فرداً ہر قیدی کو بالکل برہنہ کرا کے تلاشی لی۔ مطلب تو اس کا مجھ پر الزام لگانا تھا مگر جب میرے پاس کچھ نہ نکلا تو سارا وبال غریب عبدالحق کے سر پڑا۔ انھوں نے بہت کچھ معذرت کی۔ لیکن نائب جیلر کی فطری بے رحمی پر ذرہ برابر بھی اثر نہ ہوا اور اس نے دوسرے ہی دن سپرنٹنڈنٹ سے کہہ کر ان کی برقندازی توڑ دی اور معمولی قیدی بنا کر آگرہ کو چالان کر دیا۔

---

(۱۰)

جیل خانوں میں عام طور پر اتوار کے روز تعطیل کا دستور ہے لیکن الہ آباد سنٹرل جیل میں چکی پیسنے والے کے سوا باقی اور قیدیوں کو اس رعایت سے فائدہ اٹھانے کا موقع شاذ و نادر ہی ملتا ہے لیکن حکام جیل کی حرص قیدیوں کو ہفتے میں ایک دن کی بھی فرصت دینا گوارا نہیں کرتی۔ کیونکہ حکومت نے قید خانوں کو اچھے خاصے کارخانوں کی صورت میں تبدیل کر دیا ہے جن کا ایک روز کے لئے بھی بند رہنا جیل کی مالی امداد میں کمی واقع ہونے اور اس لئے آخر سال پر حکام جیل کی حسن کارگزاری میں نقص پیدا کر دینے کا موجب ہو سکتا ہے۔ مہذب ممالک میں مجرموں کی اصلاح خصوصیت کے ساتھ مدنظر رہتی ہے لیکن ہندوستان میں وہاں زیادہ سے زیادہ کام لینے ان پر کم سے کم خرچ کرنے کے سوا اور کوئی اصول پیش نظر نہیں رکھا جاتا۔ اتفاقی طور پر پیٹ میں درد پیدا ہو جانے یا بخار آجانے کا عذر کر کے اگر کوئی

شخص کام کرنے سے عذر کرے تو شفاخانے بھیجے جانے کے بجائے یقیناً اسے اول تو وارڈر اور بعد ازاں نائب جیلر کے ڈنڈوں کی سخت مار برداشت کرنا پڑے گی۔ قصہ مختصر یہ کہ اتوار کو بھی عموماً تقریباً کل قیدی یا تو اپنے کارخانوں کو کام کے لئے بھیج دیئے جاتے ہیں یا کوئی اور بیگاری کام انہیں دے دیا جاتا ہے۔ اتوار تو اتوار عید، بقرعید، محرم وغیرہ کو بھی تعطیل کا اور جیلوں میں دستور ہو تو ہو نینی میں مسلمانوں کے ان مذہبی تہواروں کا بھی مطلق نہیں لحاظ رکھا جاتا۔

چنانچہ بقرعید کو مسلمان عموماً مجبوراً نماز پڑھنے سے محروم رہے۔ صرف چند پرنمازوں اور بعض مخصوص قیدیوں نے یکجا ہو کر نماز پڑھی۔ راقم حروف کو میر منظر حسین صاحب نے خاص طور پر سفارش کر کے تھوڑی دیر کی چھٹی دلادی تھی ورنہ میں بھی کچھ نہ کر سکتا۔ مسلمانوں کے ساتھ تو ایسی بے اعتنائی برتی جاتی ہے مگر بڑے دن کی تقریب میں قیدیوں کو چھٹی کے علاوہ فی کس آدھ آدھ پاؤ گڑ بھی تقسیم کیا گیا۔ یوروپین اور یوریشین قیدی یوں بھی جس آرام سے رہتے ہیں اس کا ذکر ہم کسی گزشتہ پرچے میں کر چکے ہیں۔ بڑے دن کو حکام جیل کی جانب سے ان سب کی دعوت کی جاتی ہے اور طرح طرح کی مٹھائیاں میوے اور سگریٹ تقسیم کئے جاتے ہیں۔ نماز پڑھانے کے لئے پادری برابر آیا کرتا ہے۔ مسلمان غریب اگر بیچارے خود بھی چاہتے ہیں تو قواعد جیل شریعت کے خلاف انہیں مجبوراً بحالت نیم برہنگی نماز ادا کرنا پڑتی ہے۔ اگر جانگیا میں صرف ایک یا دو بالشت کپڑا زیادہ لگایا جاتے تو کافی ستر پوشی ہو سکتی ہے مگر یہ ہو تو کیوں کر ہو قیدیوں کی تو کوئی کچھ سنتا نہیں ہے۔ رہے آزاد مسلمان ان کو انگریزوں کی خوشامد اور مسلم لیگ کے ذریعے سے خاص رعایتیں حاصل کرنے کی کوشش سے کب فرصت ملتی ہے اور کبھی ملے بھی تو بھلا حکومت کے مقرر کردہ قواعد پر اعتراض کرنے کا گناہ ان سے کیوں سرزد ہونے لگا۔ اس موقع پر شاید ناظرین کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ قیدی ان تمام ابتریوں کی شکایت افسران جیل سے کر کے انسداد

کی فکر کیوں نہیں کرتے ۔ اس کا افسانہ طول وطویل ہے ۔ وارڈر یا نائب جیلر سے کسی قسم
کی شکایت کرنا بالکل فضول ہے کیونکہ جو کچھ سختیاں جیل میں ہوتی ہیں وہ یا تو خود ان کے
اشارے سے ہوتی ہیں یا کم از کم ان پر انہیں کچھ اعتراض نہیں ہوتا رہا سپرنٹنڈنٹ جیل اس
تک اول تو کسی کی رسائی نہیں ہوتی یا اگر کبھی پریڈ وغیرہ کے موقع پر کچھ کہنے سننے کا موقع
بھی ملتا ہے تو نائب جیلر کی غضب آلود نگاہ کے اثر سے "عذر" کرنے والے کے ہوش
وحواس ابتدا ہی میں غائب ہو جاتے ہیں اس پر بھی اگر کسی نے جی مضبوط کرکے کچھ عرض
کیا تو سپرنٹنڈنٹ صاحب بہادر اس کا مطلب انگریزی میں نائب جیلر سے دریافت کرتے
ہیں جو اس قیدی کی شکایت کو اپنی تشریحوں اور توجیہوں کے ساتھ اس شکل میں پیش کرتا ہے
کہ اکثر اس غریب کو لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں مثلاً الہ آباد کے سبحان نے عذر کیا کہ میرے
ہاتھ کا گٹا اترا ہوا ہے اس لئے مجھ کو آسان کام دیا جائے ۔ نائب جیلر نے بحیثیت ترجمان اس
بیان پر اپنی جانب سے اتنا اور بڑھا دیا کہ میرے خیال میں یہ شخص بہانہ کرتا ہے ۔ نتیجہ یہ ہوا
کہ چکی خانے سے اس کی مشقت تو تبدیل ہوئی نہیں البتہ ایک ماہ کے لیے بیڑیاں اس کے
پیروں میں اور ڈال دی گئیں ۔ چیری ضلع الہ آباد کے خلیل کی ایک انگلی کٹنگ مشین میں کسی
طرح سے کٹ گئی اس کی نسبت بھی نائب جیلر نے یہ بات جڑ دی کہ اس نے کام سے جان
بچانے کے لئے اپنا ہاتھ خود زخمی کر لیا ہے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بے میعادی بیڑیوں کے علاوہ
تین مہینے کے لئے چکی ان کے نام لکھ دی گئی ۔ بے چارے ایک ہاتھ سے چکی پیستے
تھے اور نائب جیلر کی جان کو روتے تھے ۔ طرفہ تر یہ کوئی شخص بطور خود اپنا حال سپرنٹنڈنٹ
سے انگریزی میں نہیں عرض کر سکتا ۔ کیونکہ انگریز سے انگریزی میں گفتگو کرنا گستاخی پر محمول
کیا جاتا ہے ۔ میں نے ایک بار بحالت ناواقفیت نائب جیلر سے کچھ بات انگریزی میں کرنا
چاہی تھی کہ ایک ہندوستانی وارڈر اس کے اشارے سے مجھ پر حملہ آور ہوا ۔ ناچار خاموشی اختیار
کی شکایت کرنے والے کی پریشانیوں کا خاتمہ نہیں ہو جاتا بلکہ عذر کرنے کے بعد نائب جیلر یا

وارڈر ہمیشہ کے لئے اس کا دشمن ہو جاتا ہے اور اس کا نام شورہ پشتوں کی فہرست میں درج کر لیا جاتا ہے۔ سال میں دو بارہ انسپکٹر جنرل صاحب بھی جیل خانوں کا معائنہ کرتے ہیں۔ انکی فریاد رسی اور انصاف پسندی کا افسانہ اور بھی زیادہ عجیب و غریب ہے: جیل میں آپ کی آمد کا ہنگامہ قیامت سے کم نہیں ہوتا۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ پہلے سے آپ کے ملاحظہ کے لئے قیدیوں کو جیل کی قواعد سکھائی جاتی ہے۔ سلامی کی پریڈ، نہانے کی پریڈ، بارک بندی پریڈ کھلنے کی پریڈ، پاخانے کی پریڈ متعدد پریڈوں کی مشق ناواقف قیدیوں کو پاگل بنا دیتی ہے۔ دن بھر کام کرنے کے بعد پھر مغرب تک اس قواعد کی مصیبت سے ناک میں دم آجاتا ہے۔ قواعد کے دوران میں اگر کبھی نائب جیلر صاحب تشریف لے آئے تو گویا ایک اور بلا نازل ہوئی۔ ہنٹر آپ کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور بے رحمی آپ کے دل میں۔ ذرا بھی کسی سے کوئی غلطی ہوئی کہ آپ نے بلا تکلف ایک ہنٹر رسید کیا

انسپکٹر جنرل کے آنے سے ایک روز قبل آپ وارڈروں کے ذریعے سے ہر بارک میں منادی کرا دیتے ہیں کہ جس کسی کو کچھ عذر کرنا ہو وہ پہلے ہم سے بیان کرے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی نے انسپکٹر جنرل سے کسی قسم کی کوئی شکایت کی تو اس کے لئے اچھا نہ ہوگا۔ قیدی بھی عموماً جیل خانے کی راہ و رسم سے واقف ہونے کے بعد شکایت کر کے خواہ مخواہ مبتلائے مصیبت ہونے سے پرہیز کرتے ہیں اور اس طرح "جنڈیل صاحب" فرض ادا کرنے کے طور پر کمال تیزگامی سارے جیل کا چکر لگا جاتے ہیں اور کوئی قیدی چوں تک نہیں کرتا۔ دوسرے دن رجسٹر معائنہ میں آپ کو یہ عبارت لکھی ہوئی نظر آئے گی کہ "سب قیدی خوش ہیں کسی کو کچھ شکایت نہیں۔ انتظام سب اچھا ہے" لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ازراہ بیباکی نائب جیلر و سپرنٹنڈنٹ جیل کی خفگی سے بے پروا ہو کر کھانے کی خرابی وارڈر کی سختی اور حکام جیل کی بیرحمی کی داستان "جنڈیل" سے کہہ بھی سنائے تو کیا ہو؟ "این خانہ تمام آفتاب است" محکمہ جیل کے ایک ادنیٰ ملازم سے لے کر انسپکٹر جنرل تک سب کے سب بیرحمی اور بے پرائی

کے یکساں رنگ میں رنگے ہوئے ہوتے ہیں۔ انسپکٹر جنرل کی سے عدیم الفرصتی اوّل اوّل تو کسی فریادی کی فریاد کو یا اطمینان سننے کی اجازت ہی نہیں دیتی لیکن اتفاق سے اگر آپ متوجہ بھی ہوتے ہیں تو اس توجہ کا نتیجہ عموماً سوا اس کے اور کچھ نہیں ہوتا کہ عذر کرنے والا اسی وقت کوٹھری میں بند کر دیا جاتا ہے دوسرے دن "جنڈیل" صاحب تو چل دیتے ہیں لیکن اس غریب کی شامت آجاتی ہے کیونکہ جنڈیل سے بلا اطلاع حکام عذر کرنے کے اس سے سخت باز پرس ہوتی ہے اور اس تمام جھگڑے کے بعد زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قیدی کسی دوسری جیل[1] کو روانہ کر دیا جاتا ہے۔ جہاں جاتے ہی یقینی طور پر اسکا نام شہدوں کی فہرست میں درج کر لیا جاتا ہے انسپکٹر جنرل کے دورے کو زندانی اصطلاح میں جنڈیلی کہتے ہیں قیدیوں کو جنڈیلی سے زحمت اور پریشانی کے سوا اور کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ اس سے بلائے ناگہانی کی طرح لرزاں و ترساں رہتے ہیں البتہ دوران معائنہ میں دو ایک روز کھانا نسبتاً ضرور اچھا ملتا ہے یعنی معمول کے خلاف روٹیوں کا آٹا مٹی اور چنے کی آمیزش سے پاک ہوتا ہے اور شام کو چولائی کے ساگ یا ڈنٹھلوں کے بجائے ترکاری کے بھی دو چار ٹکڑوں کی صورت نظر آتی ہے مجسٹریٹ علی گڑھ نے میرے مقدمہ میں سزا دہی کے سارے اختیار ختم کر دیئے تھے یعنی دو سال قید سخت اور پانچسو روپے جرمانہ زیادہ کا اگر انہیں اختیار ہوتا تو شاید اس سے بھی دریغ نہ کرتے ہائی کورٹ سے قید کی میعاد گھٹ کر دو سال سے ایک ہی سال رہ گئی

---

[1] جیل والوں کی بیدردی کا یہ افسانہ خالی از مبالغہ ہے۔ ثبوت کے لئے صوبجات متحدہ کی کونسل میں اردوئے معلیٰ کے "مشاہداتِ زنداں" کی نسبت آنریبل بابو گنگا پرشاد صاحب ورما کا سوال اور حکومت کی جانب سے اس کا مہمل جواب ملاحظہ طلب ہے بابو صاحب نے دریافت کیا تھا کہ آیا گورنمنٹ کی نظر سے اردوئے معلیٰ کے یہ مضامین گزرے ہیں اور آیا ان کی بابت کچھ تحقیقات کی جائے گی۔ انسپکٹر جنرل صاحب نے بکمال غرور و بے پروائی جواب دیا کہ گورنمنٹ کے نزدیک ان مضامین کی کوئی وقعت نہیں ہے اور ان کے متعلق نہ کوئی تحقیقات کی گئی ہے نہ آئندہ کی جائے گی۔ یہ جواب جس پر غرور الفاظ اور جس غضبناک لہجے میں دیا گیا ہے اس پر نظر کرکے ارباب انصاف

لیکن جرمانہ بدستور قائم رہا جس کے عوض میں چھ مہینے کی قید سخت کو ملا کر گویا الجملہ ڈیڑھ برس کی سزا باقی رہی۔ حکام جیل مطمئن تھے کہ کم از کم ڈیڑھ برس تک تو یہ شخص ہمارے قابو میں ہے جتنی سختی اس کے ساتھ جاری کریں چنانچہ ابتدائے قید سے کر دس ماہ تک برابر چکی پسوانا غالباً اسی اطمینان کی بناء پر تھا۔ اگر یہ میعاد قائم رہتی تو ڈیڑھ سال برابر مجھ کو چکی پیسنا پڑتی۔ لیکن دوران قید میں والد مرحوم کے انتقال کی وجہ سے بھائی صاحب کو مجبوراً کسی نہ کسی صورت سے زر جرمانہ ادا کرنا پڑا۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو جو قلیل جائیداد وراثتاً مجھ کو پہنچتی تھی وہ بھی مجسٹریٹ علی گڑھ کے حکم سے نیلام کر دی جاتی اور سرکاری نیلام جس بیدردی اور بے پروائی کے ساتھ کیا جاتا ہے اس کا نمونہ اسی مقدمہ میں لوگوں کے پیش نظر ہو چکا تھا کہ زر جرمانہ کے عوض میں اردوئے معلی کا کل کتب خانہ جس کی مجموعی قیمت تین چار ہزار روپیوں سے کسی طرح کم نہ تھی۔ صرف ساٹھ روپے میں برباد کر دیا گیا اہل حرفہ کے متعلق یہ قانون ہے کہ حکم نیلام سے ان کے پیشے کے اوزار مستثنیٰ سمجھے جاتے ہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اخبار نویسوں۔ ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ اس درجہ سختی کیوں روا رکھی جاتی ہے کہ ان کی نایاب اور قیمتی کتابیں ناقدر دانوں کے ہاتھ کوڑیوں کے مول فروخت کر دی جاتی ہیں۔ جرمانہ اسی قدر ہونا چاہیے جس قدر ملزم سے ادا ہو

---

______ خیال کر سکتے ہیں کہ اگر خدانخواستہ ایڈیٹر اردوئے معلی ہی شکایتیں کرنل صاحب بہادر سے ایک قیدی کی حیثیت سے کرتا تو اس کا کیا نتیجہ ہوتا۔ خوش قسمتی سے حسرت اس وقت آزاد اور ان کے قبضہ اقتدار سے باہر ہے۔ ورنہ قیدی پاکر آپ خدا جانے کیا غضب ڈھاتے۔ خیر آپ حاکم ہیں اور ہم لوگ محکوم جو چاہے کیجیے۔ لیکن اتنا خیال رہے کہ جبر و خودسری کے ساتھ غرور تمرد زوال کی یقینی علامتوں میں سے ہے۔ وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون ۔

سکے۔ علی گڑھ میں ہر شخص آگاہ تھا اور اسی لئے غالباً مجسٹریٹ علی گڑھ بھی ناواقف نہ ہوں گے کہ اڈیٹر اردوئے معلیٰ ایک فقیرانہ زندگی بسر کرتا ہے۔ ایسی حالت میں اس پر ۵۰۰ روپے جرمانہ کرنا اصول انصاف اور انسانیت کے کہاں تک موافق یا مخالف ہے اس کا فیصلہ ہم ناظرین کے ذمے چھوڑتے ہیں۔ اس جرمانہ کی بدولت کتب خانہ اردوئے معلیٰ کی جو حالت ہوئی اس کا بیان نہایت دردناک ہے جن کتابوں کو راقم حروف نے معلوم نہیں کن کن کوششوں اور دقتوں سے بہم پہنچایا تھا جن کتابوں میں بہت سے ایسے نایاب اور قلمی نسخے اور دواوین شعراء وغیرہ کے تھے جن کی نقل بھی کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتی ان سب کو پولیس کے جاہل جوان تھیلوں میں بھر بھر کے اس طرح سے لے گئے جیسے کہ لوگ لکڑی یا جنس لے جاتے ہیں۔ ان کتابوں کی فہرست بنانا تو بہت دور تھا کسی نے ان کو شمار تک نہ کیا۔ اس کے بعد ان کتابوں پر کیا گزری اس کا ذکر کرتے ہمارا دل دکھتا ہے۔ اس لئے اس سے قطع نظر ہی مناسب ہے۔ اس جبر و ظلم کا انصاف خدا کے ہاتھ ہے سلسلہ کلام کہاں سے کہاں جا پہنچا۔ اصل ذکر اس بات کا تھا کہ زر جرمانہ کے دفعتاً ادا ہو جانے سے قید کی میعاد صرف ایک سال رہ گئی اور پوری مشقت کرنے والے قیدیوں کو فی ماہ تین روز کے حساب سے حکومت کی جانب سے جو رہائی ملتی ہے اسے بھی شامل کرنے کے بعد میری رہائی میں صرف ایک ماہ بلکہ کچھ اس سے بھی کم عرصہ باقی رہ گیا۔ اب تو منتظمین جیل کے کان کھڑے ہوئے اور انہیں میرے ساتھ اپنے برتاؤ کی سختی کا بھی کچھ احساس ہونے لگا چنانچہ ایک روز خلاف معمول شام کے وقت بارک بند کرنے کے موقع پر نائب جیلر نے مجھ سے دریافت کیا کہ تم کو کوئی دوسری مشقت دی جائے گی اسے پسند کرو گے یا نہیں۔ لوگوں کو جناب موصوف کے اس غیر معمولی اظہار لطف و کرم پر کمال تعجب تھا لیکن راقم حروف کو ان کی نیت کا حال معلوم ہو گیا تھا کہ چند روز کے لئے کسی کارخانے میں بھیجنے سے اس کے سوا اور کوئی غرض نہیں ہے کہ مجھ سے تمام میعاد چکی پسوانے کے الزام سے بچنے کی صورت اور قسم کھانے کی

گنجائش نکل آئے۔ پس میں نے تبدیلیٔ مشقت کے اس عجیب تحفے کو قبول کرنے سے یک قلم انکار کر دیا[1]

---

(۱۱)

زمانۂ قید کے ابتدائی ایام کی سختی ضرب المثل ہے کہ قیدیوں کے ان چند دنوں کی بے چینی سالہا سال کے کرب و اضطراب سے بھی بڑھ جایا کرتی ہے۔ ابتدا میں جیل کی تکلیفوں سے نیا سابقہ پڑتا ہے اس لئے نو گرفتاران مصیبت کو کچھ روز تک مشاہدات زنداں میں عذاب دوزخ کا نمونہ نظر آتا ہے مگر رفتہ رفتہ بمصداق "ہر سر اولاد آدم ہر چہ آید بگذرد" طبیعت ان سب ذلتوں کی خوگر ہو جاتی ہے اور مایوسی قیدیوں کے دل میں ایک ایسا سکون پیدا کر دیتی ہے جس کی مدد سے مطمئن ہو جاتے ہیں ورنہ اگر ابتدائی بے قراری کا عالم بدستور قائم رہے تو ان غریبوں کی زندگی دشوار ہو جائے دو سال، پانچ سال، سات سال بلکہ چودہ چودہ سال تک کی دراز میعادیں لوگ بآسانی کاٹ دیتے ہیں لیکن آخر میں جب معلوم ہوتا ہے کہ اب ہماری قید کا صرف ایک مہینہ باقی ہے، صرف پندرہ دن باقی ہیں، صرف تین دن باقی ہیں صرف ایک ہی دن باقی ہے اس وقت کسی کا صبر و سکون برقرار نہیں رہتا۔ قواعد جیل کی رو سے قیدیوں کے ٹکٹوں پر رہائی کی تاریخ کچھ روز پہلے متعین کرکے

---

[1] تجربے سے ثابت ہوا کہ میرا قیاس بالکل صحیح تھا کیونکہ صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ میں انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات نے میرے متعلق آنریبل بابو گنگا پرشاد صاحب ورما کے ایک سوال کا جواب ایسے مبہم اور پُر فریب الفاظ میں دیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح ممبران کونسل کی ناواقفیت سے فائدہ اٹھا کر میرے اس انکار سے بھی اپنا مفید مطلب چاہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ "ایک موقع پر ملزم نے خود کسی دوسری مشقت کے قبول کرنے سے انکار کیا تھا"۔ انسپکٹر جنرل کا یہ مبہم جملہ اپنے پرفریب مفہوم کے ذریعے سے لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا کرانا چاہتا ہے کہ گویا اڈیٹر اردوئے معلیٰ نے

درج کر دی جاتی ہے جس کیلئے قیدی خاص کر سپرنٹنڈنٹ کے روبرو طلب کیا جاتا ہے۔ اس موقع پر سپرنٹنڈنٹ صاحب ازراہ کرم کبھی کبھی قیدیوں کو دو چار دن کی رہائی اپنی طرف سے مرحمت فرمایا کرتے ہیں۔ راقم حروف کو چونکہ شروع ہی سے کسی قسم کی رعایت نہ ملی تھی اس لئے اس موقع پر بھی دوسرے معمولی قیدیوں کی طرح سپرنٹنڈنٹ صاحب کے لطف و کرم کی بدولت تاریخ مقررہ سے قبل رہا ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔ اتفاق سے سپرنٹنڈنٹ صاحب نے خلاف معمول مجھے طلب کئے بغیر حساب کر کے ۲ جولائی ۹۰۸ء تاریخ رہائی مقرر کر دی جس سے اس خیال کی پوری پوری تصدیق ہو گئی۔ راقم حروف کو بزرگان دین کی عقیدت کے ساتھ جو فطری اُنس ہے اس کی بدولت زندانِ فرنگ میں جیسی کچھ قلبی قوت اور روحانی آزادی اور اطمینان میسر رہا اور ضمناً جو باطنی فیوض حاصل ہوئے الفاظ کے ذریعے سے ان کی حقیقت صحیح طور پر نہ بیان ہو سکتی ہے نہ ان کے ذکر کا یہ محل ہے اس لئے ان سے قطع نظر ہی مناسب ہے البتہ آخر زمانہ قید کا ایک واقعہ ایسا ہے جس کے اظہار میں کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا ہے۔

---

چکی کی مشقت کو از خود دوسری مشقتوں پر ترجیح دی ورنہ حکام ——— جیل مجھے دوسرا کام دینے پر آمادہ تھے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ اصل واقعہ اور انکار کا صحیح موقع وہ تھا جس کا ذکر اس مضمون میں کر دیا گیا ہے۔ کیا کرنل صاحب کی آفیشل راست بازی ہمارے اس بیان کی بھی کچھ تاویل کر سکتی ہے۔ کرنل صاحب نے یہ بھی گلفشانی فرمائی ہے کہ روزانہ ایک من غلہ پیسنے کا بیان غلط ہے۔ عام قیدیوں کی طرح اڈیٹر اردوئے معلیٰ کو بھی پندرہ سیر گیہوں، ۲ سیر چنے پیسنے کو ملتے تھے نیز یہ کہ سپرنٹنڈنٹ جیل کو اختیار ہے کہ جس قیدی کو جس سخت مشقت کے لائق دیکھے اُس پر لگائے۔ اس مختصر بیان سے کئی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں مثلاً اول تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اڈیٹر اردوئے معلیٰ کے ساتھ کوئی خاص سختی نہیں کی گئی بلکہ عام قیدیوں کی طرح چونکہ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے اسے صرف چکی پیسنے کے لائق سمجھا اس لئے اس سے برابر چکی پی

ردولی کا عرس شریف ماہ جمادی الثانی کی درمیانی تاریخوں میں ہوتا ہے ۳۸ء میں یہ تاریخیں ماہ جولائی ابتدائی تاریخوں سے مطابق واقع ہوئی تھیں۔ اتفاق سے میں نے ایک روز سوتے وقت حساب کیا تو معلوم ہوا کہ میری رہائی کا دن ٹھیک اسی تاریخ کو مقرر ہوا ہے جو عرس شریف کا آخری روز ہوگا مجھ کو چونکہ حاضری عرس حضرت شیخ العالم سے سعادت اندوز اور فیض پذیر ہونے کا اکثر اتفاق ہو چکا تھا اس لئے بے اختیار دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اگر رہائی کی تاریخ دو یا ایک روز قبل بھی مقرر ہوتی تو شرکت عرس کا موقع مل سکتا تھا لیکن تاریخ رہائی کی ٹکٹ پر درج ہو جانے کے بعد دوبارہ تبدیل ہو سکنے کا اس وقت میرے دل میں وہم و گمان بھی نہ تھا پھر بھی صبح اٹھنے پر سب سے پہلی بات جو مجھ کو معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے مجھے غیر معمولی طور پر دفتر کے بجائے نئی تکلیف میں طلب کیا ہے۔ نئی تکلیف میں پہنچ کر منشی صاحب سے معلوم ہوا صاحب بہادر میرے استقلال اور نیک چلنی سے بہت خوش ہیں اور اس لئے اپنے اختیار سے غالباً وقت

---

پسوائی گئی حالانکہ یہ سراسر غلط ہے کیونکہ کسی نیک چلن قیدی کا پوری میعاد تو کیا نصف میعاد تک چکی پیسنا بھی ناممکن ہے۔ کیونکہ چوتھائی میعاد کے گزرنے پر عام قیدی پہرے دار اور زیادہ سے زیادہ نصف میعاد گزرنے پر برقنداز بنا دیا جاتا ہے جس کا کام صرف دوسرے قیدیوں کی نگرانی کا رہ جاتا ہے۔ کیا انسپکٹر جنرل صاحب کی صداقت شعاری صوبجات متحدہ کے تمام جیلوں میں سے ایسے چند قیدیوں کے نام بھی پیش کر سکتی ہے جن سے بلا وجہ اور بلا قصور ساری میعاد چکی پسوائی گئی ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو کرنیل صاحب کا بیان یقیناً غلط سمجھا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ روزانہ ایک من غلہ پیسنے کا ذکر کرکے گویا ایڈیٹر اردوئے معلےٰ نے دروغ بیانی سے کام لیا ہے حالانکہ اس میں کچھ بھی غلطی نہیں ہے۔ غلہ تو ایک ہی من پیسنے کو ملتا ہے البتہ ایک چکی پر دو آدمی پیستے ہیں کیونکہ وزنی چکیاں ایک آدمی سے چل بھی نہیں سکتیں۔ اس حساب سے بیشک بقاعدہ ارثمیٹک فی کس ۲۰ سیر غلہ پڑتا

مقررہ سے کچھ قبل ہی مجھے رہا کر دیں گے۔ اس مژدہ جان فزا کے سننے سے مجھ کو بھی بہت مسرت ہوئی اور یقین ہو گیا کہ شب گزشتہ کی آرزو اب ضرور پوری ہو گی۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے مجھے دیکھتے ہی حکم دیا کہ ہم ان کو پندرہ دن کی رہائی اپنی جانب سے دیتے ہیں۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی اور میں تاریخ مقررہ سے پندرہ روز قبل رہا ہو کر شام تک الہ آباد میں ٹھہر کر مکان روانہ ہوا اور وہاں دس دن قیام کرنے کے بعد اطمینان تمام ردولی روانہ ہوا۔ ممکن ہے کہ اس واقعہ کو لوگ حسن اتفاق پر محمول کریں لیکن راقم کے نزدیک یہ سب کچھ شیخ العالم حضرت مخدوم احمد عبد الحق ردولوی رحمۃ اللہ علیہ کے باطنی تصرف اور توجہ کا نتیجہ تھا۔ الہ آباد سنٹرل جیل کے سپرنٹنڈنٹ مسٹر ہڈسن عجیب و غریب مزاج کے شخص تھے جن کو کل قیدی ہڈسن بابا کے نام سے یاد کرتے تھے "گلہ ہے بہ سلامے بر نخند و گلہ ہے بدشنامے خلعت دہند" کے افسانے آپ کے "دریا دلی" کے متعلق اکثر قیدیوں کی زبانی سننے میں آتے تھے۔ سخت گیری اور تند خوئی ان کی ضرب المثل تھی۔ جس سے قیدی تو قیدی جیل کے تمام آزاد ملازم بھی ہر

---

ہے لیکن از روئے تجربہ کچھ زیادہ فرق محسوس نہیں ہوتا کیونکہ جتنی دیر میں ایک شخص بیس سیر غلہ پیستا ہے اتنی دیر میں دو شخص مل کر ۳۰ سیر نہیں پیس سکتے۔ ایک چکی پر دو قیدیوں کے کام کرنے کی تفصیل ہمارے گزشتہ مضامین میں موجود ہے جن کے مطالعہ کا گورنمنٹ کو اقرار ہے لیکن اس اقرار پر بھی ایک درمیانی فقرہ یہ کہنے کہ ہم کو غلط بیانی کا ملزم قرار دینا اصول دیانت کے سراسر خلاف ہے۔ گیہوں کے پندرہ سیر اور چنوں کے بیس سیر پسنے کا افسانہ اس میں ذرہ برابر بھی صداقت نہیں ہے الہ آباد سنٹرل جیل میں گیہوں اور چنوں میں کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا بلکہ قاعدے کے خلاف گیہوں بھی فی کس ۲۰ سیر کے حساب سے ایک ہی من پسنے کو ملتے ہیں جن کا پیسنا قیدیوں کے لئے عذاب جان ہو جاتا ہے کیونکہ چنوں کی نرمی کے مقابلہ میں گیہوں کی سختی پیسنے والوں کے چھکے چھڑا دیتی ہے۔ ایک من گیہوں میں صرف پاؤ بھر چوکر باقی رکھنے کا حکم ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ پہلی اور دوسری مرتبہ آٹا چھاننے سے

وقت ترساں رہتے تھے لیکن ایک خاص وصف ان میں ایسا تھا جس نے ان کے جملہ عیوب کو چھپا دیا تھا وہ یہ کہ قیدیوں کو "نشانات رہائی" عطا کرنے میں جیسی فیاضی ان سے ظاہر ہوتی تھی غالباً کسی دوسرے سپرنٹنڈنٹ سے نہ ہوئی ہوگی۔ جس کی بدولت اکثر سات سال کے قیدی پانچ ہی پانچ سال بلکہ کچھ اس سے بھی کم میعاد کاٹ کر رہا ہو گئے الہ آباد جیل کی خرابیوں اور اپنی نسبت حکام جیل کی سختیوں کے باوجود مسٹر ہڈسن کی بعض انتظامی خوبیوں کی تعریف نہ کرنا بعید از انصاف ہوگا مثلاً صفائی اور ظاہری جسمانی صحت کا لحاظ جیسا الہ آباد سنٹرل جیل میں ہوتا ہے ویسا کسی دوسری جگہ نہیں ہوتا جس کا معمولی ثبوت یہ ہے کہ جیل میں قیدیوں کے کپڑے موسم سرما میں بھی "جوں" سے پاک رہتے ہیں۔ درآنحالیکہ عام طور پر "زنداں" اور "جوں" لازم ملزوم سمجھے جاتے ہیں۔ ملازمان جیل کی زدوکوب اور سختی جو زیادہ تر قیدیوں سے حصول زر کی غرض سے ہوتی ہے اس کی بھی شکایتیں الہ آباد جیل میں مسٹر ہڈسن کے خوف سے بہت کم سننے میں آئیں اور میعاد قید میں تخفیف کر دینے کا حال ہم نے پہلے ہی درج کر دیا ہے قید کی تکلیفوں میں سب سے بڑی تکلیف اس روحانی بے چینی کو سمجھنا چاہیے جو ارتکاب جرائم کے لازمی نتیجہ کی صورت میں یقیناً ہر "یکبارہ" قیدی کے عارض حال ہوتی ہے میں چونکہ بعنایت ایزدی اس تکلیف سے آزاد تھا، اس لئے ظاہری سختیوں کے برداشت کرنے میں مجھ کو کچھ زیادہ دقت محسوس نہیں ہوئی اور رہا ہونے پر ایسا معلوم ہوا کہ گویا ایک سال تک مجھے کسی غیر ملک کا سفر درپیش تھا جہاں سے اب میں اپنے وطن کو واپس آرہا ہوں۔ وطن پہنچ کر جہاں اپنے دوستوں اور عزیزوں سے ملنے کی خواہش تھی وہیں اپنے جدید

---

جتنا چر کر نکلتا ہے اُسے دوبارہ اور سہ بارہ پیسنا پڑتا ہے اور اس طرح بلا مبالغہ ایک من کی جگہ ڈیڑھ من کے قریب پیسنا پڑ جاتا ہے کیا انسپکٹر جنرل صاحب ان واقعات کی تردید بھی کر سکتے ہیں؟ ہمارا ارادہ ان جزوی معاملات کو اس قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کا نہ تھا لیکن کرنل صاحب کے طرز بیان سے مجبور ہو کر ہمیں بھی دروغ گو را تا بخانہ باید رسانید کے مقولے پر عمل کرنا پڑا۔

دوستوں سے جدا ہونے کا کسی قدر افسوس بھی ضرور تھا کہ ان میں سے چند کے سوا باقی سب سے پھر کبھی ملاقات ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔ میرا یہ افسوس تو خیر رہائی کی خوشی سے مغلوب ہو گیا تھا لیکن ان گرفتاران بلا کو میری جدائی نہایت شاق تھی، جن میں سے بعض کی آنکھیں تو مجھ سے جدا ہوتے وقت بے اختیار اشک افشانی میں مصروف تھیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو جلد اس مصیبت سے نجات دے۔ جیل میں مختلف مقامات سے آئے ہوئے قیدیوں کے اختلاف عادات و اخلاق و زبان و لہجہ کی دلچسپ کیفیت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے پھر ان میں سے ہر شخص اپنے عجیب و غریب واقعات زندگی کی ایک مختصری تاریخ بھی رکھتا ہے جو اکثر اوقات مصنوعی کہانیوں سے بھی زیادہ دل پسند ہوا کرتی ہے۔ راقم حروف بارک بند ہونے کے بعد سے سونے کے وقت تک اپنا وقت اکثر انہیں افسانوں کے سننے میں بسر کرتا تھا۔ مرحوم عبداللہ غازی آبادی اپنے "گھی کے روزگار" کی ایسی ایسی حیرت انگیز حکایتیں بیان کرتے تھے کہ سننے والے دنگ رہ جاتے تھے۔ ۶½ سیر تک گھی بغیر کسی قسم کے ظاہری فریب کے لے سکتے تھے یعنی اس میں ہاتھ کی صفائی کو مطلق دخل نہ تھا کیونکہ خود تولتے بھی نہ تھے بلکہ بیچنے والوں ہی سے تلواتے تھے، پھر جب خود فروخت کرتے تھے تو ۶ سیر کی جگہ ۵ سیری اسی ترکیب سے دے دیتے تھے۔ ذاکر برقنداز نے ان سے بقسم اقرار لیا تھا کہ رہا ہونے پر "گھی کا روزگار" ہمیں بھی سکھا دینا مگر افسوس کہ دفعتاً رہائی سے صرف ایک ماہ قبل انھوں نے درخت پر سے گر کر انتقال کیا۔ انہوں نے میرے ساتھ جس انسانیت اور محبت کا برتاؤ کیا۔ اس کی کیفیت درج رسالہ ہو چکی ہے۔ رہا ہونے پر میں نے سب سے پہلے ان کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھنا چاہا مگر افسوس کہ قبر کا صحیح نشان نہ مل سکا اب بھی ہر سال شبرات کے موقع پر اپنے دیگر مرحوم اعزا و احباب کے فاتحہ کے ساتھ عبداللہ مرحوم کا فاتحہ بھی میں نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔

زید پور ضلع ہمیرپور کے منشی نند لال سابق ڈپٹی پوسٹ ماسٹر فن زراعت

سے بھی بخوبی واقف تھے۔ وہ اکثر محکمہ ڈاک کی خفیہ کارروائیوں اور فن زراعت کے اصول پر طویل لکچر دیا کرتے تھے۔ اردو معمولی اور ہندی خوب جانتے تھے راقم حروف نے ہندی لکھنے پڑھنے کی مشق انھیں سے کی۔

رک پور ضلع بارہ بنکی کے گرچرن کوری پاٹن دین کے مشہور گروہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی بہادری کے قصے اکثر سنایا کرتے تھے غریب بیکسوں اور بیواؤں کے ساتھ پاٹن دین کے سلوک کی حکایتیں بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوا کرتی تھیں۔ پاٹن دین جس کسی سے ایک بار مدد کا وعدہ کر لیا کرتے پھر اس سے کسی حالت میں روگردانی نہ کرتے تھے چودھری مہدی حسن صاحب رئیس ضلع بارہ بنکی کا بھی ہم نے اکثر لوگوں کو حد سے زیادہ مداح پایا۔ چودھری صاحب کے مقدمہ کے دلچسپ حالات نندا پاسی اور عبدالکریم ملازم ممدوح کی زبانی سننے میں آیا کرتے تھے جس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ حکومت کی جانب سے ان پر ضرورت سے زیادہ سختی کی گئی۔ واللہ اعلم۔

ضلع بہرائچ کے منشی ہدایت اللہ کبوتر بازی کے فن میں کامل تھے کبوتروں کے تمام اقسام اور پھر ان سب کی خصوصیات اور حالات کے بیان سے وہ کبھی نہ تھکتے تھے۔ میری غزلوں کو وہ بڑے شوق سے لکھ کر یاد کر لیتے تھے۔

ضلع اعظم گڑھ کے پنڈت جگت دھاری چترال کی مہم میں شریک ہو چکے تھے جس کے تمام مفصل حالات سے وہ بخوبی آگاہ تھے اقوام سرحد کے افعال و عادات اور معرکہ چترال کے واقعات کا ذکر وہ نہایت جوش کے ساتھ کیا کرتے تھے ضلع جھانسی کا سنوان کھنگار مہم تبت میں شریک رہا تھا اور اپنے فوج میں بھرتی ہوتے وقت سے لے کر مہم تبت کے بعد گھر واپس آنے تک کے کل حالات تھوڑے تھوڑے روز سنایا کرتا تھا۔ مہم تبت کے دوران میں سرکاری رپورٹوں سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ انگریزوں کا نقصان بہت قلیل ہوا۔ لیکن سنوان کے قول کے مطابق تبتیوں کی بنا کردہ برف پوش خندقوں میں

گوروں کی صفیں کی صفیں گر گر ایسی غائب ہو جاتی تھیں کہ پھر اُن کا پتہ نہ لگتا تھا۔ اہل تبت کے رسم و رواج اور وہاں کی عورتوں کے دلچسپ حالات کو سوال خاص لطف کے ساتھ بیان کیا کرتا تھا۔

امروہہ کے منشی ایزد بخش صاحب کا حال ہم لکھ چکے ہیں جیل خانے کی برقندازی سے پہلے یہ درزی خانے میں تھے جہاں کے سارے پوست کندہ حالات ان کی زبانی اکثر سننے میں آتے تھے۔

منشی نول بہاری سے غلہ گودام کا کچا چٹھا معلوم ہوا کرتا تھا۔ جس کے ظاہر کرنے کی ہمت ہم میں نہیں ہے کیٹگنج الہ آباد کے گنیش اہیر روزانہ صبح کو بھجن وغیرہ گایا کرتے تھے۔ راقم حروف کو ان کے اکثر بھجن اور ہندی گیت بغایت مرغوب تھے خصوصاً وہ جو سری کرشن کی تعریف میں ہوتے تھے مثلاً

دیکھو ری مائی تیرے دوارا اک بالا جوگی آیا ۔ رنگ بھبھوت گلے مرگ چھالا شیس ناگ لٹپایا
لے بھچھا نکلیں نند رانی موتن تھال بھرایا ۔ بھچھا لیکے لوٹ جا بابا میرا بالک ڈیکھ ڈرایا
ناچاہوں میں دولت دینا ناچاہوں میں مایا ۔ اپنے گوپال کا درس دکھاوے درسن ہیت میں آیا
لے موہن نکلیں نند رانی آنچل اوٹ چھپایا ۔ پانچ ہر پھیر ماں کر کے سنگھی ناتھ بجایا

جیسہ درشن شر، نربن ترسیں
جسودا گو دکھلایا،

---

(۱۲)

ضلع جونپور کے منشی محمد رضا سات سال کے لئے قید تھے۔ ان کے مذہبی عقیدت اور خلوص کو دیکھ کر راقم حروف کو اکثر رشک ہوا کرتا تھا۔ اس مجبوری کی حالت میں بھی ہر ماہ کی گیارہویں تاریخ کو کسی نہ کسی طرح سے شیرینی منگا کر وہ حضرت غوث پاک کی نیاز ضرور دلاتے تھے۔ جیل میں باہر سے کسی چیز کو اندر لے جانے کی سخت ممانعت ہے۔ یہاں تک معلوم ہو جانے پر قانون کے خلاف عمل کرنے والے کو چھ ماہ تک کی سزا ہو سکتی ہے۔

لیکن ان سب مواقعات کے باوجود منشی محمد رضا نے کبھی اپنے معمول میں فرق نہیں آنے دیا۔ وظیفہ وظائف کا بھی ان کو بہت شوق تھا۔ اکثر دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد چکی خانے میں میرے پاس آتے تھے اور ذوق وشوق کی گفتگو کے بعد نمک، ہری مرچیں گڑ یا شیرینی بطور تحفہ ضرور پیش کرتے تھے۔ نعت و منقبت کے اشعار سے انھیں نہایت محبت تھی اکثر غزلیں مجھ سے سُن کر زبانی یاد کرلی تھیں۔ جن کو رات کے وقت بعد نماز تہجد پڑھا کرتے تھے۔ اکثر غزلیں مجھ سے سُن کر زبانی یاد کرلی تھیں۔ جن کو رات کے وقت بعد نماز تہجد پڑھا کرتے تھے حسن اتفاق کہ میرے رہا ہونے سے دس ہی پندرہ دن قبل ہماری بارک کا ایک برقنداز کم ہوگیا۔ جس کی جگہ منشی محمد رضا صاحب آئے اس تبدیلی پر ہم دونوں بہت خوش ہوئے۔ صبح صادق کے وقت وہ مجھے بیدار کردیا کرتے تھے اور نماز فجر ہم دونوں مل کر بکمال شادمانی ادا کیا کرتے تھے جب کبھی وہ زمانہ یاد آجاتا ہے تو طبیعت بے چین ہوجاتی ہے کہ نماز صبح میں سرور قلب کی وہ کیفیت کیونکر حاصل ہو۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے جناب رسالتمآب کی شان میں کوئی شعر پڑھا ہو اور ان کی آنکھیں پرنم نہ ہوگئی ہوں۔

وصلی اللہ علیٰ نورے کزو شد نور ہا پیدا
زمیں از حب او ساکن فلک در عشق او شیدا

کالپی کے منشی عبدالحمید افسانہ گوئی کے فن میں کامل تھے چار پانچ مہینے تک ان کا ساتھ رہا اور کوئی نہ کوئی نیا قصہ وہ ضرور کہتے تھے اس پر بھی ان کی کہانیوں کا سلسلہ ختم نہ ہوا۔ شاہجہاں پور کے چھتا استاد بھی ہانکنے کا کام جانتے تھے جیل کے کاموں میں "موسنج فرش" ان سے بہتر کوئی نہ بنا سکتا تھا۔ اکثر ان کو گڑ انعام ملا کرتا تھا۔ اس میں سے بکمال فراخ حوصلگی استاد میرا حصہ علیحدہ نکال رکھتے تھے اور کام سے واپس آکر نذر کیا کرتے تھے۔

سوامی شوانند بھی اسی "موسنج فرش" کے کارخانے میں بان بٹا کرتے تھے اس لیے جو کچھ پیام سلام ہوا کرتا تھا وہ استاد ہی کے ذریعہ سے ہوتا تھا۔

ضلع فیض آباد کے بابا سر جو داس ہندی کے عالم اور سنسکرت سے بھی واقف اپنے کسی چیلے کے فریب کی وجہ سے چار سال کے لیے قید تھے انہوں نے بھی جیل میں اپنے فقیری معمولات میں فرق نہیں آنے دیا۔ روزانہ بھجن اور سادھن وغیرہ کے علاوہ شام کو گنیش وغیرہ چند لوگوں کو رامائن کا سبق دیا کرتے تھے میں بھی اکثر ان کے درس میں شریک ہوا کرتا تھا۔ صفائی کا بابا صاحب کو بہت خیال تھا چنانچہ روزان کے چیلے ان کے ڈھیلے کے اردگرد دور تک لیپ پوت کر کے صاف کر رکھتے تھے ان کے واسطے روزانہ خوراکیں بھی مقرر تھیں۔ راقم حروف کے حال پر بابا جی بہت مہربان تھے یہاں تک کہ خاص اپنے چبوترے کے برابر والے چبوترے پر مجھے رہنے کی اجازت دی اور میرے مسلمان ہونے کا مطلق خیال نہ کیا تھا۔ صبح صادق سے بہت قبل آٹھ کر وہ بھی اپنے وظیفہ میں مصروف ہو جاتے تھے۔

جھانسی کی طرف کے پنڈت سیتارام مسٹر تلک کے معتقد تھے اور اس لیے میرے بھی بڑے مداح تھے ان کا کام انگریزی دفتر میں تھا۔ جہاں سے مجھ کو اکثر پولیٹکل خبریں انہیں کے ذریعہ سے ملا کرتی تھیں مثلاً سے نوجوان وطن کی جلاوطنی کا مجمل حال اول اول انھیں سے معلوم ہوا۔

ضلع الہ آباد کے بہاری برقنداز کو انگریزی پڑھنے کا شوق تھا۔ روز شام کو وہ مجھ سے سبق لیا کرتے تھے پڑھانے میں ان کی شفقت تھی جہاں سے روز تھوڑی سی پیاز اور نمک مرچ میرے لئے لانا انھوں نے اپنے اوپر لازم کر لیا تھا۔

کوڑہ جہاں آباد کے ایک اور قیدی بہاری نام نے بھی اکثر نازک موقعوں پر میری بہت مدد کی مثلاً جس روز نائب جیلر نے منشی عبدالحق صاحب برقنداز چکی خانہ کے ساتھ سارے چکی خانے کی بھی تلاشی لی اس وقت ان کا سارا شبہ میری جانب تھا کہ یہی کچھ نہ کچھ لکھا کرتا ہے۔ اتفاق سے ایک غزل کا مسودہ میری ٹوپی میں تھا اور میں پریشان تھا کہ کیا کروں۔ بہاری نے مجھ سے فوراً پوچھا کہ آپ کے پاس کوئی کاغذ تو نہیں ہے اگر ہو تو مجھ کو دے دیجیے کہیں اسے چھپاؤں گا اور اگر میرے پاس نکل بھی آئے گا تو میں آپ کے عوض سزا برداشت

کرنے پر بخوشی راضی ہوں۔

غرضکہ وہ پرزہ اس نے لے کر معلوم نہیں کہاں غائب کیا کہ برہنہ تلاشی لئے جانے پر بھی کہیں دستیاب نہ ہوا۔ لیکن نائب جیلر کے جانے کے بعد پھر کہیں سے نکال کر مجھ کو واپس کر دیا۔

ضلع بجنور کے منشی شام سنگھ آریہ سماج کے ایک پرجوش ممبر تھے۔ مزاج ان کا نہایت گرم تھا۔ چنانچہ اسی گرم مزاج بدولت علی گڑھ ڈیری فارم سے ان پر مقدمہ چلا تھا مجھ سے علی گڑھی ہونے کی بنا پر وہ پرانی تکلیف میں خاص کر ملنے آئے اور پھر اپنی رہائی کے بعد تک ہر قسم کی مدد کرتے رہے۔ منشی رام سروپ اور سوامی شوانند کے ساتھ بھی انھوں نے ایسا ہی کچھ سلوک کیا۔

جیلر برقندانہ قوم کا باسی الٰہ آباد کا باشندہ تھا اور ذاکر کے جانے کے بعد آخر تک ہماری بارک کا برقنداز رہا۔ جیسا شریفانہ سلوک جیلر نے میرے ساتھ کیا اس پر نظر کر کے اکثر میں خیال کرتا تھا کہ طینت کی نیکی اور بدی کو ذات پات کے قیود سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تعلیم کا شوق بھی جیسا میں نے جیلر میں دیکھا ویسا کسی دوسرے شخص میں نہیں دیکھا۔ بیادش بخیر مولوی محمد اسمٰعیل صاحب میرٹھی کی ریڈرس کو پڑھ پڑھ کر اس نے اردو میں اچھی خاصی مہارت پیدا کر لی تھی۔ اکثر آموختہ مجھ کو سنایا کرتا تھا اور فارسی عربی الفاظ کے معنی دریافت کیا کرتا تھا۔

غرضکہ ایک سال کے عرصہ میں ہزاروں ایسے واقعات پیش آئے اور ایسے سیکڑوں لوگوں سے ملاقات ہوئی جن کا مختصر حال لکھنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوتا لیکن سلسلہ کلام کی غیر معمولی طوالت پر نظر کر کے ہم اس داستان کو یہیں پر ختم کئے دیتے ہیں۔ البتہ ماہ آئندہ میں ہمارے نزدیک انتظام جیل میں جو اصلاحیں ہو سکتی ہیں ان کو ہم مختصر طور پر درج کر دیں گے، ان کی طرف توجہ کرنا یا نہ کرنا دوسروں کا کام ہے۔

(۱۳)

مجرموں کو قید کرنے سے قانون کا صرف یہی منشا نہیں ہوتا کہ ان کو جسمانی یا روحانی اذیت دی جائے بلکہ ایک غرض یہ بھی ہوتی ہے کہ آئندہ کے لئے ان کے اخلاق وعادات میں نمایاں درستی ظہور پذیر ہو اور دوران قید میں وہ کوئی نہ کوئی ہنر یا پیشہ سیکھ کر سوسائٹی کے ایک کارآمد ممبر بن جائیں۔

اگر حکام زنداں اس اصول کو پیش نظر رکھا کریں تو جیل خانوں کی بہت سی خرابیاں خود بخود رفع ہو جائیں مگر افسوس کہ ہندوستان میں قید خانوں کی موجودہ حالت ان جبری کارخانوں سے ذرہ برابر بھی بہتر نہیں جن کے منتظمین نے اپنا صرف ایک اصول مقرر کر لیا ہو کہ اپنے پابند و مجبور مزدوروں (قیدیوں) سے زیادہ سے زیادہ کام لیں لیکن ان پر کم سے کم خرچ کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جی لگا کر بہت کم قیدی کام کرتے ہیں۔ خوراک و پوشاک کے باب میں اگر موجودہ قواعد جیل کی پوری پابندی کی جاتے تو بھی قیدیوں کو بہت کچھ آرام مل سکتا ہے مگر حقیقت حال یہ ہے کہ سزا دہی اور سختی کے جتنے قواعد ہیں ان کی تو ایک ایک حرف کی پابندی اکثر اوقات ضرورت سے زیادہ کی جاتی ہے لیکن جو قاعدے ان کے مفید مطلب ہیں ان کا کسی کو خیال تک نہیں آتا مثلاً۔

(۱) قیدیوں کو فی کس ۹ چھٹانک روٹی ملنا چاہیئے لیکن عام طور پر ۷ یا ۸ چھٹانک سے زیادہ کبھی نہیں ملتی اور وہ بھی زیادتی وزن کے خیال سے اکثر کچی رکھی جاتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نادار لوگ چکی پیستے وقت کچا غلہ یا آٹا کھا کر اپنا پیٹ بھرتے ہیں اور جن کے پاس خفیہ طور پر روپیہ پیسہ پہنچ سکتا ہے وہ باورچیوں سے زائد خوراک مقرر کر لیتے ہیں یا کچا آٹا مول لیتے ہیں۔ جتنا آٹا اس طرح فروخت کیا جاتا ہے یا چکی خانہ میں کھایا جاتا ہے اس کے بجائے مٹی ملا دی جاتی ہے۔ اب فی کس ایک یا ڈیڑھ چھٹانک کے حساب سے جو آٹا بچتا ہے وہ کہاں جاتا ہے اس کی حالت ناگفتہ بہ ہے روٹیوں کے ساتھ فی کس آدھ پاؤ دال دیئے

جانے کا حکم ہے جس میں نمک مرچ اور گھی یا تیل بھی کافی مقدار میں پڑنا چاہیئے لیکن دال کبھی ایک چھٹانک سے زیادہ نہیں ہوتی اور نمک مرچ یا روغن کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ جس قیدی کے حصے میں اتفاقاً کبھی کوئی مرچ آجاتی ہے تو وہ اپنے کو بڑا خوش قسمت خیال کرتا ہے ورنہ یہ سب چیزیں دفعداروں کا حق سمجھی جاتی ہیں اگر جیلر یا وارڈر ذرا سی تکلیف گوارا کریں اپنے اوپر گوارا کریں تو یہ سب شکایتیں رفع ہو سکتی ہیں بشرطیکہ ان سب باتوں سے وہ لوگ دیدہ دانستہ چشم پوشی نہ کرتے ہوں۔ شام کے وقت دال کے بجائے چولائی کا جو ساگ ترکاری کے نام سے قیدیوں کو دیا جاتا ہے اس میں اور گھاس میں ہم کو کبھی کوئی فرق نظر نہیں آیا کم از کم اسکو تو ضرور موقوف کرنا اور اس کے بجائے جاری کرنا چاہیے۔

(۲) پوشاک کے بارے میں یہ حکم ہے کہ ہر ششماہی میں ایک جوڑا کپڑا نیا ہر قیدی کو دیا جائے لیکن الہ آباد سنٹرل جیل میں اس قاعدے کی مطلق پابندی نہیں کی جاتی اور عام طور پر قیدی چیتھڑے لگائے پھرتے ہیں البتہ اہل مقدرت ناجائز طور پر نئے کپڑے خرید کر کے پہنتے ہیں کپڑوں میں سے کرتے اور ٹوپی میں کوئی عیب نہیں ہوتا۔ جانگیا کی لمبائی البتہ کم ہوتی ہے جس کو پہن کر نماز کے لئے کافی ستر پوشی نہیں ہو سکتی کم از کم نمازی قیدیوں کو اگر بھیرے والوں کے مانند جانگیا ملا کرے تو یہ شکایت بآسانی رفع ہو سکتی ہے۔

(۳) باہم لڑائی جھگڑے پر ہر جیل میں سخت سزائیں دی جاتی ہیں لیکن گالی گلوج کی کوئی روک ٹوک نہیں ہے نتیجہ اس کا یہ ہے کہ فحش الفاظ اور گالیاں جیل خانوں میں اس قدر رائج ہیں کہ آزاد لوگوں کی بدترین سوسائٹی میں بھی غالباً اس کی مثال نہ ملے گی عیسائی قیدیوں کی طرح اگر ہندو مسلمان قیدیوں کی مذہبی تعلیم کا کم از کم ہفتے میں ایک بار بھی انتظام ہو سکے تو اس قسم کے بہت سے اخلاقی عیوب ضرور کم ہو جائیں۔

پھر مخبری کرنے یا چغلی کھانے پر قیدیوں کو سزا کی جگہ اکثر جو فائدہ پہنچایا جاتا ہے اُسے تو یکقلم موقوف ہونا چاہیئے کیونکہ اس سے ان کے اخلاق پر حد درجہ ناگوار اثر پڑتا ہے خلاف

قاعدہ اور اکثر بے قصور مار پیٹ سے بھی قیدیوں میں غیر معمولی بیحیائی پیدا ہو جاتی ہے اس کا سدباب بھی ممکن ہے بشرطیکہ حکام جیل قیدیوں کی درستی اخلاق کو ذرہ برابر بھی اہم خیال کریں۔

(۴) بہت سے قیدیوں کو ہم نے نوشت و خواند کا اس قدر شوقین دیکھا کہ اگر ان کو کوئی موقع ملتا تو رہا ہونے پر وہ اچھے خاصے لکھے پڑھے بن کر نکلتے لیکن معلوم نہیں کس سبب سے کتاب تو درکنار کاغذ کا ایک پرزہ تک رکھنا جائز نہیں سمجھا جاتا۔ ہمارے نزدیک اگر ہفتہ میں ایک روز تعطیل کے دن یعنی اتوار کو کم سے کم مذہبی کتابیں پڑھنے پڑھانے کی اجازت مل جایا کرے تو بہت خوب ہو۔ اس کا انتظام بھی کچھ دشوار نہیں ہے ہر بارک میں جو تین یا چار قیدی برقنداز مقرر کئے جاتے ہیں ان میں سے دو ایک خواندہ ضرور ہوتے ہیں پس بروز تعطیل شوقین قیدیوں کی تعلیم کا اہتمام انہیں کے سپرد کر دینا چاہیئے۔

(۵) بعض بعض کارخانوں میں قیدیوں سے ان کی طاقت سے زیادہ کام لیا جاتا ہے مثلاً الہ آباد سنٹرل جیل کے رینڈی خانے میں قیدی طلوع آفتاب کے وقت سے کر اکثر اوقات غروب کے وقت تک محنت کرتے کرتے پست ہو جاتے ہیں، ایسا ہرگز نہ ہونا چاہیئے۔ ہمارے نزدیک لوہار خانہ، بڑھئی خانہ، رینڈی خانہ نیز پارچہ بافی اور صنایع فرش وغیرہ کے کارخانوں میں صرف چند پیسوں کی خوراک کے عوض روپیوں کا کام کرنے والے قیدیوں کے نام اگر کچھ قلیل اجرت بھی جمع ہوا کرے جو ان کو رہائی کے وقت بطور سرمایہ مل جایا کرے تو مجرموں کا دوبارہ و سہ بارہ قیدخانے جانا یقیناً کم ہو جائے۔

(۶) پولیٹکل قیدیوں پر عام قیدیوں سے بھی زیادہ سختی کی جاتی ہے اور وہ جیل خانہ کی تمام جائز رعایتوں سے محروم رکھے جاتے ہیں۔ ایسا ہونا کسی طرح قرین انصاف نہیں ہے اور کچھ نہیں ہو سکتا تو اس غیر معمولی سختی کے معاوضے میں کم از کم رعایت ضرور ملنا چاہیئے کہ اوقات فرصت میں انھیں کتب بینی کی اجازت ہو اور ان میں سے جس کو تصنیف یا تالیف

کا شوق ہو تو اسے اتوار کے روز ایک خاص پارک میں کسی یورپین وارڈر کی نگرانی میں قلم دوات کاغذ کے استعمال کا بھی موقع دیا جاتا ہے۔

من آنچہ شرط بلاغ ست با تو میگویم
تو خواہ از سخنم پند گیر خواہ ملال

## فرنگی جیل خانوں میں گورے اور کالے کی تمیز

دنیا کے معمولی کاروبار میں عموماً اور ریلوے سفر میں خصوصاً اہل ہند کو اکثر اس امر کا ناگوار تجربہ ہوا ہوگا کہ صرف رنگ کے فرق نے ان کے اور یورپین یا یوریشین اصحاب کے درمیان ایک ایسا عجیب و غریب امتیاز قائم کر دیا جس کی بنا تعصب یا غرور کے سوا اور کسی جذبہ پر ہرگز نہیں ہو سکتی۔ افسوس ہے کہ رنگ کے اس بیجا امتیاز کا دائرہ اس قدر وسیع ہو گیا ہے کہ عدالت ایوان اور جیل کی کوٹھریاں بھی اس کے حدود کے اندر آ گئی ہیں۔ عدالتوں میں فرنگیوں کے ادعائے انصاف کے خلاف گوروں کے ساتھ جو رعایتیں ملحوظ اور کالوں پر جو جو سختیاں جائز اور قانوناً ناجائز رکھی جاتی ہیں ان کی تفصیل ایک جداگانہ دفتر کی محتاج ہے اس موقع پر ہم ان کے بیان سے قطع نظر کر کے صرف جیل کے حالات پر اس لئے اور بھی اکتفا کرتے ہیں کہ جیل کی کیفیت سے عام طور پر لوگ ناآشنا ہیں۔

۱۔ **خوراک**:۔ کالوں کے لئے صبح کو آدھ پاؤ چنے بطور ناشتہ دیئے جانے کا حکم ہے لیکن عموماً قیدیوں کو چھٹانک ڈیڑھ چھٹانک سے زیادہ نہیں ملتے ناشتہ کے بعد کام پر جانا ہوتا ہے جہاں سے ۱۱ بجے کھانا کھانے کے لئے کچھ دیر کی فرصت ملتی ہے۔ کھانے میں جوار، باجرہ، ماش اور گیہوں کے مخلوط آٹے کی کچی روٹیاں ہوتی ہیں جس میں گیہوں کی مقدار سے کچھ ہی کم مٹی یا آٹا ملا ہوتا ہے جیل کی سخت مشقت سے مشق تو کیا ہے کنکر پتھر بھی ہضم ہو جائیں ورنہ کسی آزاد شخص کا معدہ اس روٹی کو قبول نہیں کر سکتا۔ ان روٹیوں کو کچا رکھنے کی مصلحت یہ ہے کہ اول تو پکانے کے لئے پتھر کے کوئلے اس قدر کم ملتے ہیں کہ

نئے وغیرہ قیدی باورچی، کو کچی روٹی پکانے پر مجبور رہونا پڑتا ہے دوسرے یہ کہ کچھ روٹی کے بھاری ہونے کے سبب سے مقررہ وزن کی روٹیاں کم آٹے میں تیار ہو جاتی ہیں۔ بچا ہوا آٹا دوسرے لوگوں کے کام آتا ہے۔ پکی ہوئی روٹی نو چھٹانک ملنے کا حکم ہے لیکن عموماً آٹھ چھٹانک بلکہ کبھی کبھی سات چھٹانک سے بھی کم ملتی ہے اور کسی کو چوں وچرا کی ہمت نہیں ہوتی راقم حروف نے ایک بار وارڈر وغیرہ ملازمان جیل کی خفگی سے بے پروا ہو کر بطور تجربہ روٹیاں تلوائیں تو وہ چھ چھٹانک سے کچھ ہی زیادہ نکلیں۔ معلوم نہیں آٹا جو اس طرح بچتا ہے وہ کہاں جاتا ہے اور وہ کس کے صرف میں آتا ہے کیونکہ گودام میں روزانہ مقررہ وزن کے آٹے کا خرچ دکھلایا جاتا ہے۔ روٹی کے ساتھ کھانے کے لئے دوپہر کو ابلی ہوئی بجنلی اُدہر عموماً بے روغن و مرچ ملتی ہے اور شام کو چولائی کا ساگ جس کی ادنیٰ صفت یہ ہے کہ پھینک دیئے جانے پر کوّے بھی اسے نہیں سونگھتے۔ ترکاری جو مختلف قسم کی جیل میں بوئی جاتی ہے روزانہ ڈالیوں میں ملازمان جیل کے لئے بھیج دی جاتی ہے یا کبھی کبھی کچھ ملتی بھی ہے تو وہ پکانے والوں کے صرف میں آتی ہے۔ عام قیدیوں کو کبھی اس کی صورت بھی نہیں دیکھنے کو ملتی۔ برخلاف اس کے گوروں کو ناشتے کے لئے ڈبل روٹی، چاء شکر اور کھانے کے لئے گھی، گوشت، ترکاری، چاول دودھ غرض شکر سب کچھ ملتا ہے اور کافی مقدار میں ملتا ہے۔

**پوشاک:۔** کالے قیدیوں کو ایک لنگوٹ ایک جانگیا ایک کرتا ایک ٹاٹ۔ ایک کمبل ایک ٹوپی کے سوا اور کچھ نہیں ملتا جن میں سے ٹاٹ کمبل سالہا سال کے لئے اور جانگیا کرتا قاعدے کی رو سے چھ مہینے کے لئے لیکن از روئے عمل سال بھر بلکہ بعض اوقات اس سے بھی زیادہ دنوں کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے اگر اس درمیان میں یہ چیزیں پھٹ جائیں یا خراب ہو جائیں تو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ قیدی بغرض احتیاط صرف صبح و شام کو انھیں استعمال کرتے ہیں باقی

سارا دن کام صرف لنگوٹ باندھ کر کیا کرتے ہیں اگر کسی کے پاس ان کپڑوں سے زیادہ کوئی چیز پائی جائے تو اسے سخت سزا دی جاتی ہے برخلاف اس کے گوروں کو لوٹ کے کئی جوڑے مع موزوں کے ملتے ہیں۔ پہننے کے لئے متعدد سوٹ جن کے دھونے کے لئے علیحدہ ہندوستانی قیدی دھوبی کا کام کرتے ہیں لیٹنے کے لئے مسہری اس پر گدا اور چادر غرض کہ آرام کی تمام چیزیں مہیا کی جاتی ہیں۔

## جائے قیام و دیگر ضروریات

کالوں کے رہنے کے لئے بارکیں ہیں جن میں برابر برابر مٹی کے ڈھیلے یا اونچے زنجیر ترسے بنے ہوتے ہیں جاڑا گرمی برسات غرضکہ ہر موسم میں انہیں پر سونا چاہیئے سخت گرمی کے دنوں میں کاغذ وغیرہ کا مصنوعی پنکھا بھی رکھنا ممنوع ہے۔ رات کو پاخانے کا کوئی معقول بندوبست نہیں ہوتا جس سے بعض اوقات سخت تکلیف ہوتی ہے صبح کو جب بارک کا دروازہ کھلتا ہے تو سب قیدی ایک ساتھ پاخانے جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بیسیوں قیدیوں کو آخر تک منتظر رہنا پڑتا ہے اور کبھی کبھی جب گھنٹی سے کام لیا جاتا ہے تو اور بھی زیادہ دقت کا سامنا ہوتا ہے کیونکہ گھنٹی دو یا تین منٹ سے زیادہ پاخانے میں رہنے کی اجازت نہیں دیتی جس کے بعد بلا توقف باہر نکل آنا چاہیئے ہر چند کہ کل قیدی فارغ ہوئے ہوں یا نہ ہوں، پاخانے کے بعد ہاتھ منہ دھونے کا کوئی وقت نہیں ملتا بلکہ اکثر وہاں سے سیدھے کام پر جانا پڑتا ہے۔ برخلاف اس کے گوروں کے لئے فی کس ایک کمرہ علیحدہ ملتا ہے جس میں ایک آہنی پلنگ گدے دار ایک میز ایک اسٹول ایک لیمپ اور ہر کمرے کے ساتھ ایک غسل خانہ اور ایک پاخانہ موجود ہوتا ہے غسل خانہ میں تولیہ، صابن ہر شے موجود رہتی ہے۔ رات کو لیمپ کی روشنی میں اور دن کو فرصت کے اوقات میں گورے قیدی کتابیں اور کبھی کبھی اخبار بلا تکلف دیکھتے ہیں۔ ان کے لکھنے کو دوات قلم ہر وقت موجود رہتا ہے حالانکہ کالوں کے لئے کتاب دیکھنا تو درکنار اگر ان کے پاس کاغذ کے ایک پرزے کا بھی شبہ ہو تو قیامت آجائے۔

چنانچہ خود راقم حروف کی ایک بار اسی شبہ میں یورپین وارڈر کے حکم سے جامہ تلاشی لی گئی اگرچہ کچھ برآمد نہیں ہوا۔

سب سے بڑا تماشہ یہ ہے کہ ہر یورپین قیدی کے کمرے پر دو ہندوستانی قیدی رات بھر پنکھا قلی کا کام دیتے ہیں۔ بارہ بجے تک ایک اور پھر صبح تک دوسرا قیدی پنکھا کھینچا کرتا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

## فرائض مذہبی اور عام برتاؤ

گوروں کے لئے ہر ہفتہ میں ایک یا دو بار پادری صاحب آ کے وعظ فرماتے ہیں اور ایک جگہ نماز پڑھی جاتی ہے لیکن کالوں کی مذہبی ضروریات کی جانب کبھی بھول کر توجہ نہیں کی جاتی۔ عام قیدیوں کی پوشاک میں جانگیا کی لمبائی اس قدر کم ہوتی ہے کہ جسم اسفل ان تک بالکل کھلا رہتا ہے اور اس طرح پر نماز کے لئے کافی ستر پوشی نہیں ہو سکتی۔ یہ کمی ایسی ہے کہ صرف دو بالشت کپڑا زیادہ استعمال کرنے سے رفع ہو سکتی ہے لیکن کوئی اس کی جانب توجہ نہیں کرتا راقم حروف مجبوراً اسی حالت نیم برہنگی میں نماز پڑھا کرتا تھا۔ کالوں کے لئے مذہبی وعظ و تلقین کا انتظام تو درکنار اخلاقی جرموں کے ارتکاب پر سزا کے عوض انہیں الٹا انعام ملتا ہے اور بعض حالتوں میں تو حکام جیل ایک طرح پر انہیں ایک دوسرے کی غیبت، جاسوسی، سب وشتم، مار دھاڑ اور ظلم سختی کی ترغیب دیتے ہیں کیونکہ غیبت یا جاسوسی کرنے والے قیدی ہر طرح کی رعایت کے مستحق قرار دیئے جاتے ہیں اور قیدی نمبرداروں میں تو خاص کر ایسے ہی لوگ ان کے منظور نظر ٹھہرتے ہیں جو اپنے ساتھیوں میں سب سے زیادہ چالاک، پاجی، ظالم اور بدزبان مشہور ہوں۔ مسلمانوں کے تہوار عید، بقرعید، شب برات، محرم میں شاذ و نادر ہی کسی تہوار پر تعطیل ہوتی ہے حالانکہ گوروں کیلئے بڑے دن کے ایام میں جیلر وغیرہ کی طرف سے دعوت کا سامان کیا جاتا ہے اور ان کو ہر قسم کے میوے اور کھانے دیئے جاتے ہیں اس کے علاوہ عام برتاؤ میں گوروں کو کالوں پر ہر طرح سے فوقیت حاصل ہوتی

سے کام انہیں ہلکا ملتا ہے ۔ اپنے عزیزوں یا دوستوں سے ملنے اور خط و کتابت کرنے میں انھیں زیادہ آسانی ہوتی ہے ہر سواری پر سپرنٹنڈنٹ جیل کار گزار قیدیوں کو رہائی کے چھ دن اپنی طرف سے دیتا ہے اس رعایت سے یہی سب سے زیادہ مستفید ہوتے ہیں ۔ ملازمان جیل انھیں کسی طرح دق نہیں کر سکتے بلکہ اکثر موقعوں پر دیدہ و دانستہ ان کی بے ضابطگیوں سے چشم پوشی کرتے ہیں غرضکہ ہر صورت سے ان کی قید کا زمانہ اس طرح سے گزرتا ہے کہ بعض آوارہ مزاج کرائیوں سے کو تو ہم نے یہ کہتے سنا کہ ہم کو گھر سے زیادہ تو جیل ہی میں آرام ہے ۔

# سید الاحرار مولانا حسرت موہانی کے چند نادر اشعار

## جو اُن کی کلیات سے لیے گئے ہیں

نگاہِ ناز جسے آشنائے راز کرے
وہ کیوں نہ خوبیٔ قسمت پہ اپنے ناز کرے
خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے
ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرت
اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

یاد کر وہ دن کہ تیرا کوئی شیدائی نہ تھا
باوجودِ حسن تو آگاہِ رعنائی نہ تھا
عشقِ روز افزوں پہ اپنے مجھکو حیرانی نہ تھی
جلوۂ رنگیں پہ تجھکو نازِ یکتائی نہ تھا
کیا ہوئے وہ دن کہ محوِ آرزو تھے حسن و عشق
ربط تھا دونوں میں گو ربطِ شناسائی نہ تھا

جو راہِ غم میں تیرا پائمال ہو نہ سکا
وہ باریابِ مقامِ کمال ہو نہ سکا
وہ جب ملے تو مجھے شادمانِ غم پایا
مرے ملال سے اُن کو ملال ہو نہ سکا
وہ ابتدائے محبت وہ انتہا کے مزے
کہ جن میں پڑکے خیالِ مآل ہو نہ سکا
حضورِ یار گئے بھی تو کیا ہوا حسرت
سلام کر نہ سکے ہم سوال ہو نہ سکا

دل اُن سے مل کر اب اُن کو بھلا نہیں سکتا
مگر یہ کیوں ہے کہ میں خود بھی بتا نہیں سکتا
یہ کس کے عجزِ تمنا کا پاس ہے کہ وہ شوخ
بہ زعمِ ناز بھی دامن چھڑا نہیں سکتا
اگرچہ میں ہمہ تن درد ہوں مگر حسرت
کوئی جو پوچھے کہاں ہے بتا نہیں سکتا

# سیّد الاحرار

سیّد الاحرار مولانا حسرت موہانی کی ذاتی، ازدواجی اور سیاسی زندگی کے حوالے سے اردو اکادمی بہاولپور نے ۱۹۷۶ء میں سیّد الاحرار کے نام سے ایک سوانح عمری شائع کی تھی. جسے سیّد اشتیاق اظہر نے تحریر کیا تھا.

سیّد الاحرار کی اشاعتِ ثانی کا اہتمام حسرت موہانی میموریل سوسائٹی نے ۱۹۸۸ء میں کیا. اور اس میں ذاتی زندگی کے باب میں مزید اضافوں کے ساتھ مولانا حسرت موہانی کی مذہبی زندگی کا باب بھی شاملِ اشاعت کیا گیا اور آخر میں بعض بے انتہا مفید حواشی بھی شاملِ اشاعت کئے گئے ہیں.

مشہور بھارتی مصنّف، دانشور، شاعر اور ادیب ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد نے اس کتاب کو مولانا حسرت موہانی کی زندگی کی انسائیکلوپیڈیا قرار دیا ہے. اور ایک اور مشہور مُصنّف مولانا محمّد صادق قصوری نے اس کتاب کے بارے میں یہ تحریر کیا ہے کہ اس کی اشاعت سے مولانا حسرت موہانی ایک زندہ وجاوید تاریخی حقیقت بن گئے ہیں.

# حسرت کی کہانی۔ نعیمہ کی زبانی

سیّد الاحرار مولانا حسرت موہانی کی صاحبزادی نعیمہ بیگم کی یہ تصنیف سب سے پہلے ۱۹۵۹ء میں حیدرآباد سندھ سے شائع ہوئی تھی. اب اسے دوسری مرتبہ حسرت موہانی میموریل سوسائٹی کے زیرِ اہتمام شائع کیا گیا ہے. یہ ایک عظیم باپ کے بارے میں ایک چہیتی بیٹی کے تاثرات کی آئینہ دار ہے.

---

**سیّد الاحرار اور حسرت موہانی کی کہانی۔ نعیمہ کی زبانی**
**حاصل کرنے کے لئے درج ذیل پتے پر رجوع فرمائیں**

---


حسرت موہانی میموریل سوسائٹی (ہال اینڈ لائبریری)
بمقام: ST 9/C بلاک "اے"۔ متصل جامع مسجد
نارتھ ناظم آباد۔ کراچی۔ پاکستان فون: ۶۸۶۱۱۴۹ - ۶۷۸۳۰۸